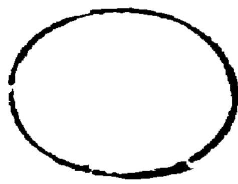
صدائے حق

مولانا ابوالکلام آزادؒ



ناشر

شاہین بک سینٹر

9/5539 پرانا سیلم پور دہلی 110031

اس میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے

امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر مفصل بحث

اور

احکام خداوندی کی تشریح کی ہے۔

اشاعتِ اوّل :- ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنہ ۱۹۸۶ء
ناشر :- ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمد اقبال
تعداد :- ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ہزار
قیمت :- ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۷-۰۰ سات روپے

سول ایجنٹ برائے کشمیر

شیخ محمد عثمان اینڈ سنز

گاؤکدل چوک ۔ ایکس چینج روڈ ۔ سرینگر ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الامر بالمعروف والنهی عن المنکر

الحب فی اللہ والبغض فی اللہ۔ الساکت عن الحق شیطان اخرس

کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ اُخرِجَت لِلنَّاسِ تَامُرُونَ بِالمَعرُوفِ
وَتَنهَونَ عَنِ المُنکَرِ وَ تُؤمِنُونَ بِاللّٰہِ
(۳ : ۱۰۶)

ایک اصولی بحث

سچ یہ ہے کہ پُل صراط کی راہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ اور اس کے نیچے آتش جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ لیکن اس کا سامنا صرف قیامت کے دن پر کیوں اٹھا رکھا جائے؟ (الدنیا مزرعۃ الاخرۃ) آج دنیا کے سفر میں بھی پُل صراط ہر شخص کے سامنے ہے۔

یہ پُل صراط در حقیقت (اخلاق) کی دشوار گزار راہ ہے۔ جذبات و امیال انسانی کے اعتدال کا لاینحل مسئلہ ہی اصل پُل صراط ہے، بال سے زیادہ باریک تلوار کی دھار سے زیادہ تیز اور اس کے نیچے ہلاکت اور بربادی کا قعر، آدم کی اولاد میں سے کوئی نہیں جس کو اس پر ایک بار نہ گزرنا ہو۔ وان منکم الا واردھا کان علی ربک حتماً مقضیا (تم میں سے کوئی نہیں جو اس پر سے نہ

لئے بڑے ہو۔ ظالم سے اس کے ظلم کا اور مجرم سے اس کے جرم کا مطالبہ کرتا ہے، پہلی حالت میں جس قدر عاجز تھا۔ اتنا ہی اس حالت میں مغرور و متکبر ہو جاتا ہے۔ پہلے اگر عاجزوں کے جھکے ہوئے سروں کو اٹھا کر اپنے سینہ پر جگہ دیتا تھا۔ تو اب سرکشوں کے سروں کو اپنی ٹھوکروں سے پامال کرتا ہے۔ اور پھر ساتھ ہی حالت یہ ہے کہ اس کی پہلی تعلیم سے اگر صرف معبدوں اور خانقاہوں میں رونق پیدا ہوتی تھی۔ تو اس عمل سے پوری دنیا میں انتظام اور قانون پیدا ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں اصول کے لئے ایک سخت تصادم اور کشمکش پیدا ہو جاتی ہے اور فیصلہ بیکار ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان متضاد حالات میں راہ تطبیق کیا ہے۔ عفو و درگذر کے اصول سے کام لیجئے۔ تو دنیا میں نیکی و بدی کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ انتقام و پاداش کی راہ اختیار کیجئے تو دنیا سے رحم و محبت نابود ہو جاتی ہے۔ سب کو اچھا کہئے۔ تو صرف اچھوں کے لئے پھر آپ کے پاس کیا ہے، برائی کیجئے۔ تو اس کے حدود اور فیصلہ کن اصول کیا ہیں۔

آج ملک میں جو طبقہ شخصی حکومت کے جراثیم سے مریض ہو رہا ہے۔ وہ گو خود جان بلب ہے، مگر اس کی نظر اپنے مرض پر نہیں بلکہ دوسروں کی شکایتوں پر ہے۔ غلامی کے حلقوں کے لئے سب کے کان چھیدے ہوئے ہیں۔ پاؤں برسوں سے بوجھل بیڑیوں کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان حلقوں اور بیڑیوں کے

گزرے ، یہ ایک وعدہ اور فیصلہ ہے ، جس کو خدا نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے ۔ ۱۹ : ۷۲)

اخلاق کے سینکڑوں مشکل مسائل میں سے ایک مشکل تر مگر اصولی مسئلہ حسد و بغض ، تولا و تبرا تحسین و تذلیل اور عفو و انتقام کا بھی ہے ، ایک طرف اخلاق ہم کو تلقین کرتا ہے ۔ کہ دل کو محبت کے لئے مخصوص کر دو کہ اس گھر کے لئے یہی قانون موزوں ہے ۔ انیس سو برس پیشتر کا ایک اسرائیلی واعظ کہتا ہے کہ دشمنوں کو بھی پیار کرو ، کیوں کہ اگر صرف چاہنے والے کو چاہا تو تمہارے لئے کیا اجر !

اخلاق کے اولین اور سامنے کے سبق یہی ہیں ۔ کہ پیار کرو ، خاکسار بنو ، کسی سے بغض نہ رکھو ۔ سب کی عزت کرو ۔ انسان کی انسانیت کا بغیر تفریق ادب کرو ۔ اور جس کو سامنے دیکھو سر جھکا دو ۔ سوسائٹی نے بھی صدیوں سے ان تعلیموں کو اعتقاداً قبول کر لیا ہے ۔ اور اصطلاحی اخلاق مروت ، پاس و لحاظ شرم و حیا ، شرافت و انسانیت ۔ تمام الفاظ انہیں معنوں میں بولے جاتے ہیں ۔

لیکن اس کے مقابلہ میں اسی اخلاق کا ایک دوسرے پارٹ ہے ، جہاں اگر اس کی یہ غریب و مسکین صورت ایک سخت اور جابرانہ خشونت سے بدلی ہو جاتی ہے ۔ اور دنیا میں اگر اس کی صدا پہلی تعلیم دیتی ہے ۔ تو خود اس کا عمل دوسری شکل میں سامنے آتا ہے ۔ وہ چور کو قید کرتا ہے ۔ قاتل کو پھانسی پر چڑھاتا ہے ۔ نیکی کی جتنی تعریف کرتا ہے اتنا ہی بدی کو برا بھی کہتا ہے ۔ زید کو کہتا ہے کہ وہ نیک ہے ، اس لئے اچھا ہے ۔ عمرو کو کہتا ہے کہ تم بداعمال ہو اس

کو تو نے اپنا معبود بنایا تو میں تجھ کو قید کر دوں گا ۲۶ : ۲۹) کا غل مچ جاتا ہے
اور صرف یہ معبودان باطل ہی نہیں بلکہ ان کے پرستار بھی چاروں طرف سے
ٹوٹ پڑتے ہیں یہ ایک قدیم سنت ہے۔ اور دنیا میں جب کبھی سچائی آئی ہے تو
اس کو ہمیشہ ایسے ہی لوگوں سے مقابل ہونا پڑا ہے۔ فما کان جواب قومہ
الا ان قالوا حرقوہ وانصروا الھتکم ان کنتم فاعلین۔ (۲۱:۶۸)

ایسے موقعوں پر عموماً اخلاقی مواعظ سے کام لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ
بڑے آدمیوں پر حملہ کرنا انسانیت اور تہذیب کے خلاف ہے۔ گالیاں دینا کوئی
اچھی عادت نہیں، اختلاف رائے ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ کوئی ایسی بات
نہیں کہ مخالف آرا رکھنے والوں کی تذلیل و تحقیر کی جائے۔ پھر اگر ایسا کرنے کے
لئے آپ مجبور ہیں تو ذرا لہجہ نرم کیجئے اور شکایت بھی کیجئے تو شکر کے لہجہ
میں کیجئے۔ نرمی اور محبت سے کام نکلے تو سختی دکھلانا شان شرافت نہیں۔

آج کل بھی کہ ہوشیاری و بیداری کی نہیں تو خمار و سرشاری کی ایک کروٹ
تو مسلمانوں نے ضرور بدلی ہے۔ نکتہ چینوں کی زبانوں کو ایسے ہی ظاہر فریب
اور اخلاق نما جملوں سے بند کیا جا رہا ہے۔ پس ہم چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے اصولاً
اس مسئلے پر غور کریں۔ کہ فی الحقیقت اس بارے میں کوئی فیصلہ ہمارے پاس ہے
یا نہیں؟ کسی کو برا کہنا یقیناً اچھی بات نہیں۔ دل محبت کے لئے ہے نہ کہ عداوت
کے لئے۔ لیکن کیا ایسی صورتیں بھی ہیں جن میں یہ برائی ہی سب سے بڑی نیکی
اور بھلائی ہو جا سکتی ہے۔؟

سب سے پہلے اسے اخلاق کے عام اصول کے لحاظ سے دیکھئے۔ جب بھی

لئے ضرور نہیں کہ وہ تخت و تاج ہی کے طرف سے بخشے گئے ہوں۔ بلکہ ہر چاندی کا ڈھیر، ہر قیمتی کپڑا، ہر قیمتی موٹر، ہر ہوٹل کی اعلیٰ ترین منزل کا مقیم اور ہر وہ مدعی جس کے گلے میں طاقت اور جیب میں سکّے ہوں۔ ایک قانونی اور موروثی حق رکھتا ہے۔ کہ جس کو چاہے اپنی حلقۂ غلامی کے انتساب کا فخر دیدے۔ رسول عربی کے وقت تین سو ساٹھ بُت تھے۔ جن سے بیت خلیل کی دیواریں چھپ گئی تھیں لیکن آج اس کی اُمت میں ہر چمکیلی ہستی لات و منات کی قائم مقام ہے۔ اور ہر حکام ہر رئیس ہر حکام میں سب سے آخر مگر سب سے پہلے ہر خوش لباس لیڈر ایک بُت کا حکم رکھتا ہے، پوری ملّت موحّد اُن کی پوجا اور پرستش میں مشغول ہے اور بعینہ اس پرستش کا وہی جواب رکھتی ہے جو قریش مکہ کے پاس تھا کہ:- مَا نعبدھم الا لیقربونا الا اللہ زلفی (۳۸: ۷) ویعبدون من دون اللہ مالا ینفعھم ویضرھم ویقولون ھؤلآء شفعآء نا۔

اس انسان پرستی ہی کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ بالعموم طبیعتیں مدح و تحسین کی عادی ہو گئی ہیں، نکتہ چینی اور نقد و اعتراض کی متحمل نہیں ہو سکتیں، ہر شخص مخاطب سے اگر کوئی قدرتی امید رکھتا ہے تو وہ یہی ہوتی ہے کہ مدح و منقبت کا ترانہ سنائے اور بادۂ تحسین و آفرین کی پے در پے بخشش سے ساقی کا ہاتھ کبھی نہ تھکے۔ شرک و بُت پرستی کے اس عام سکون میں اگر صدائے توحید خلل انداز ہوتی ہے۔ تو ہر طرف سے اپنے ایک قدیمی پیشرو کی طرح لئن اتخذت الٰھا غیری لاجعلنك من المسجونین ؎ اگر میرے سوا کسی دوسری ذات

محبت، نرمی و عاجزی انسان کے لئے سب سے بڑی نیکی ہے۔ لیکن کن کے سامنے؟ عاجزوں اور درماندوں کے سامنے نہ کہ ظالموں اور مجرموں کے آگے۔ ایک مسکین و فلاکت زدہ پر رحم کیجئے، تو سب سے بڑی نیکی ہے۔ اور ایک ظالم پر کیجئے۔ تو وہ سب سے بڑی بدی ہے۔ گرے ہوؤں کو اٹھائیے۔ تاکہ وہ چل سکیں۔ لیکن اگر سرکشوں کو ٹھوکر نہ لگائیے گا۔ تو وہ گرے ہوؤں کو اور گرا دیں گے، قانون کو دیکھئے تو وہ جرم کو روکنے کے لئے خود جرم کرتا ہے۔ خون ریزی اس کے سامنے سب سے بڑی معصیت ہے۔ لیکن خون ریزی کو روکنے کے لئے وہ قاتلوں کے خون بہانے ہی میں امن دیکھتا ہے۔ قاتل کا قتل بدی تھا۔ لیکن عدالت کا فتوئ قتل نیکی ہو گیا۔ ہم نے بغیر کسی ترکیب کے چند جملے پھیلا دیئے۔ کیوں کہ یہ اخلاق کے ایسے عام اعلان ہیں جن کو یاد دلا دینا ہی کافی ہے۔ پس جو لوگ کہتے ہیں کہ ہر انسان اخلاقاً نرمی، آشتی اور محبت و عفو کا مستحق ہے اور کسی کا برائی کے ساتھ ذکر کرنا اخلاق کے اصول کے خلاف ہے وہ اخلاق کے نام سے ایسی بداخلاقی کی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ جس پر اگر ایک لمحے کے لئے بھی عمل کیا جائے تو دنیا شیطان کا تخت گاہ بن جائے نیکی و اعمال کا نظام درہم برہم ہو جائے، قانون، اخلاق، مذہب حسن و قبح کی تمیز اور نور و ظلمت کی تفریق۔ کوئی بھی خدا کو خوش کرنے والی چیز دنیا میں باقی نہ رہے۔

یاد رکھو کہ ہر محبت کے لئے ایک بغض لازمی ہے اور کوئی عاجزی نہیں کر سکتا جب تک کہ متکبر و مغرور بھی نہ ہو۔ نیکی کو اگر پسند کرو گے۔ تو اس کی خاطر بدی کو برا کہنا ہی پڑے گا۔ اور خدا کو خوش رکھنا چاہتے ہو تو شیطان کی دشمنی

فیصلہ صاف ہے۔ دنیا میں جس دن اخلاق نے کہا۔ کہ نیکی کو نیک اور نیک عمل کو اچھا کہو۔ کیوں کہ بغیر اس کے دنیا میں نیکی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسی وقت اس نے ضمناً یہ بھی کہہ دیا کہ نیکی کی خاطر بدی کو برا اور بدعمل کو قابل نفرین سمجھو کیوں کہ نیکی کو اس کا حق تحسین مل نہیں سکتا۔ جب تک بدی کو اس کی سرزنش اور نفرین نہ مل جائے۔

زیادہ غور کیجئے۔ تو یہ ایک قدرتی اور عام معمولی بات ہے۔ گو اس کا آپ کو حس نہ ہوا۔ دنیا میں اخلاقی محاسن فی الحقیقت ایسے اعراض ہیں جو بغیر کسی اضافی تعلق کے کوئی وجود مستقل نہیں رکھ سکتے۔ یہی سبب ہے کہ ان کا فیصلہ قطعی ہمیشہ سے مشکل رہا ہے۔ اور اب بھی مشکل ہے پس ان محاسن و فضائل کا اگر کوئی وجود ہے۔ تو صرف ان کے اضداد کے تقابل ہی کا نتیجہ ہے۔ جب تک رذائل انسانی کو نمایاں نہ کیجئے گا۔ فضائل انسانی وجود پذیر نہ ہوں گے۔ اس کے لئے روشنی اور تاریکی کی مثال شاید فہم مقصد میں معین ہو کہ روشنی کا وجود صرف تاریکی کے وجود ہی کا نتیجہ ہے۔

رہا اخلاقی تلقینات اور اعمال کا اختلاف، تو یہ تو اخلاق کے ہر مسئلہ میں درپیش ہے مگر درحقیقت دونوں صورتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ اخلاق دنیا میں کسی شئے کو فی نفسہٖ اچھا یا برا کہنے کا فیصلہ نہیں کر سکا۔ اس کی ہر تعلیم نسبت و اضافت سے وابستہ ہے۔ اور اس کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ کوئی شئے اس کے آگے نہ تو اچھی ہے اور نہ بری ایک ہی چیز کا بعض حالتوں میں نام نیکی ہوتا ہے اور بعض حالتوں میں بدی یہی حال اس مسئلہ کا بھی ہے، عفو و درگزر، آشتی و

المنکر کو بطور ایک اصول کے پیش کیا ہے۔ اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ کا اس کو فرض قرار دیا ہے۔ لیکن اسی رکوع میں آگے چل کر دوسری آیت ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت الناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ (۳ : ۱۹)	تمام امتوں میں تم سب سے بہتر امت ہو کہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو

ایک تیسری آیت میں مسلمانوں کا یہ ملّی امتیاز اور قومی فرض زیادہ نمایاں طور پر بتلایا ہے۔

وکذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھدآء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (۲ : ۱۴۷)	اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی اور وسط کی امت بنایا تاکہ اور لوگوں کے مقابلہ میں تم گواہ ہو اور تمہارے مقابلہ میں تمہارا رسول گواہ ہو۔

تفسیر آیات

ان تین آیتوں میں خدا تعالیٰ نے خاص طور پر مسلمانوں کا اصلی مشن، مقصد تخلیق قومی امتیاز، اور اشرف خصوصی اسی چیز کو قرار دیا ہے۔ کہ گو دنیا میں اعلان حق ہر برگزیدہ ہستی اور جماعت کا فرض رہا ہو۔ مگر مسلمانوں کا تو سرمایہ زندگی یہی فرض ہے۔ وہ دنیا میں اس لئے کھڑے کئے گئے ہیں کہ خیر کی طرف داعی ہوتے ہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں۔ اور برائی کو جہاں کہیں دیکھتے ہیں اپنے تئیں اس کا ذمہ دار سمجھ کر روکتے ہیں۔ آخری آیت میں کہا کہ تم کو ایک وسطی ملّت بنایا گیا۔ تاکہ تم اولین و آخرین کے لئے گواہ بن سکو۔ اور اس امر کی کہ تم نے اپنا یہ فرض ادا کیا یا

کی پرواہ مت کرو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کے فیصلہ کن حدود معین ہونے چاہئیں۔ نرمی و آشتی اور عفو و درگذر کے مقامات کیا کیا ہیں۔ اور سخت گیری و پاداش و انتقام کا حق کس موقعہ پر حاصل ہوتا ہے۔ ؟

عام اخلاق کے اصول بھی ان سوالوں کا جواب شاید دے سکتے ہیں۔ مگر ہم تو دنیا کی ہر شے کو مذہب ہی میں ڈھونڈھتے ہیں اور پھر اس کے بعد نہیں جانتے کہ دنیا میں اور کیا کہا جاتا ہے ؟ ہمارے ہاتھ میں قرآن کریم ایک امام مبین تبیاناً لکل شئی، بیان للناس، نور و کتاب مبین۔ اور انسان کے ہر اختلاف و نزاع کے لئے ایک حاکم ناطق ہے اور پھر اس کا عملی نمونہ اور وجود ظلی اس کے حامل و مبین کی زندگی کے اعمال ہیں کہ لقد کان لکم فی رسول اسوۃ حسنہ)

پس ان سوالوں کا جواب بھی وہیں ڈھونڈھنا چاہیئے۔

اسلام نے اپنی تعلیم اور دعوت اور اپنی امت کے قیام و بقا کے لئے اساس اولین اور نظام بنیادی ایک اصول کو قرار دیا ہے اور اس کو وہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" سے تعبیر کرتا ہے۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر واولئک ھم المفلحون (۳: ۱۰۴)	تم میں ایک جماعت ہونی چاہیئے جو دنیا کو نیکی کی دعوت دے بھلائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے یہی فلاح پانے والے ہیں۔

اس آیت میں خدائے تعالےٰ نے دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن

الناس ویکسوھم) اور یہیں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر یہ وصف امتیازی ان سے جاتا رہے۔ تو پھر وہ بہترین امت ہونے کے شرف سے بھی محروم ہو جائیں اور ان کا اصلی قومی امتیاز ان میں باقی نہ رہے۔

تیسری آیت کی تفسیر

تیسری آیت میں ان کو وسط کی اُمّت قرار دیا۔ اور پھر اس کا سبب یہ بیان کیا گیا کہ "تاکہ تم لوگوں کے گواہ ہو۔ افسوس ہے کہ ایسی صاف اور سلجھی ہوئی بات میں بھی ہمارے بعض مفسرین نے لاحاصل بحثیں پیدا کر دیں اور اس بحث میں پڑ گئے کہ یہ شہادت دنیا میں ہوگی یا آخرت میں ؟ اسلام کا اصلی کارنامہ غیر فانی دنیا ہی کی اصلاح تھا۔ مگر مفسرین اس کی طرف سے اس درجہ غافل ہیں۔ کہ ہر شے کو آخرت ہی پر اٹھا رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے موقعہ پر اسی شہادت کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی ذکر کیا گیا ہے کہ :۔ کنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم (میں اپنی اُمّت پر شاہد تھا۔ جب تک کہ میں ان میں موجود تھا) اور ظاہر ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ اپنی امّت میں دنیا کے اندر ہی موجود تھے۔ نہ کہ آخرت میں۔ پس یہاں بھی شہادت سے وہی شہادت مراد ہے۔ جو دنیا کی زندگی میں انجام دی جا سکتی ہے۔

تاہم (علامہ رازی) کا ہمیشہ ممنون ہونا پڑتا ہے۔ کہ وہ گو ہر آیت کے متعلق طرح طرح کی توجیہات جمع کر دیتے ہیں۔ مگر پھر بھی ایک نہ ایک ایسی توجیہہ ضرور ان میں موجود ہوتی ہے۔ جو اصل حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے۔ اور وہی خود ان

نہیں تمہارا رسول امین اللہ کے آگے گواہ ہو۔ اخلاق کے تمام دفتر کا متن قرآن کا یہی اصول ہے۔ دنیا میں سوسائٹی کے آداب اور قانون کا احتساب بھی اسی اصل الاصول پر قائم ہے۔

گو تفصیل کا موقعہ نہیں مگر ان آیات کے متعلق چند تفسیری اشارات کو دینا فہم مقصد میں معین ہو گا۔

امر بالمعروف حکم عام ہے

دوسری آیت میں اسی لئے (المعروف) اور (المنکر) پر الف لام استغراق کے لئے آیا تاکہ (بقول امام رازی) معروف اور منکر میں کوئی تخصیص و تحدید باقی نہ رہے اور ظاہر ہو جائے کہ وہ ہر نیکی کے لئے آمر اور بدی کے لئے ناہی ہیں۔ عام اس سے وہ وہ کہیں ہو اور کسی صورت میں ہو۔

(وهذا يقتضى كونهم آمرين بكل معروف وناهين عن كل منكر - (تفسیر کبیر ۲ صفحہ ۲۲۵)

مسلمانوں کے ملی شرف و فضیلت کی علت

(خیر امة اخرجت للناس) کے بعد امر بالمعروف کا ذکر کیا، اور یہ اس لئے کہ پہلے وصف بیان کر کے پھر اس کی علت بیان کی جائے یعنی مسلمانوں کا بہترین امت ہونا صرف ان کے اس وصف پر منحصر ہے کہ وہ آمر بالمعروف و ناہی عن المنکر ہیں۔ خیر کی دعوت دیتے ہیں اور شر سے روکتے ہیں (کما تقول زید کریم

"اے وہ میرے بندو کہ تم نے اپنے نفسوں پر اسراف کیا ہے۔ رحمتِ الٰہی سے مایوس نہ ہو۔" یہاں مسرفین سے مراد سخت درجے کے گنہگار اور معصیت شعار انسان ہیں کیونکہ آیت کا شانِ نزول نیز آگے چل کر :۔ (ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا) کہنا اس کی پوری طرح تشریح کر دیتا ہے۔ اسراف کی تعریف (صرف الشئ فیما ینبغی) (صرف الشیٔ علی ما ینبغی) اور تجاوز الحد فی کل شیٔ داعیہ ہے یعنی کسی چیز کو اس کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اور ہر شے کا اپنی حد سے تجاوز کر جانا۔ اس سے بڑھ کر گناہ کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ کہ وہ قوتوں اور خواہشوں کے بے اعتدالانہ خرچ کا نام ہے (اسراف) کے علاوہ اصطلاح قرآنی میں ایک لفظ (تبذیر) بھی ہے جیسا کہ فرمایا۔ ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین (بے موقع اور بے ضرورت مال و دولت کو ضائع کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں) لیکن تبذیر اور اسراف میں ایک باریک فرق یہ ہے۔ کہ شے کے خرچ کرنے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ بعض چیزیں خرچ تو کی جاتی ہیں ان کے ٹھیک ٹھیک مصرف میں۔ لیکن تعداد صرف ضرورت اور حد معینہ سے زائد ہوتی ہے۔ اور طریق صرف صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک جرم پر اس کے قصور سے زیادہ غضبناک ہونا اور مناسب سزا دینے کی جگہ مار پیٹ سے کام لینا بے شک ایک مجرم کو اس کے جرم کی پاداش ملنی چاہیئے۔ اور اس لحاظ سے آپ کے غصے اور غضب کا خرچ اپنے صحیح مصرف میں ہوا۔ لیکن جس مقدار اور جس صورت میں غصے کو آپ خرچ کر رہے ہیں۔ یہ اس کے حدود اور اس کی ضرورت سے زیادہ ہے اور اسی کا نام (اسراف) ہے۔

کی ذاتی رائے ہوتی ہے۔ اس آیت کے متعلق بھی انہوں نے دوسرے قول کو بیان کرتے ہوئے جو کچھ لکھ دیا ہے۔ وہ بالکل صاف اور غیر پیچیدہ ہے (ج۔ ۱۱۳۴۵)

امتہ وسطاً

اصل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مسلمانوں کا فرض منصبی قرار دیا۔ اور فی الحقیقت ایسا کرنا دنیا میں عدل حقیقی کو قائم کرنا تھا۔ برائی اگر روک دی جائے اور نیکی کو رائج کیا جائے۔ تو دنیا کے نظم کے قوام کا اس کے علاوہ اور کیا اعتدال ہو سکتا ہے؟ عدل کے معنی ہیں عدم افراط و تفریط یعنی کسی شے کا نہ زیادہ ہونا اور نہ کم ہونا۔ اور یہ درجہ مقام (وسط) اور درمیانی ہے۔

گناہ کی حقیقت اور اصطلاح قرآنی میں "اسراف"

دنیا میں جس قدر برائیاں ہیں غور کیجئے تو وہ افراط و تفریط کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ انسان کے تحفظ خود اختیاری اور حفظ حقوق کے لئے غیرت غضب اور ہیجان کا ہونا ضروری تھا۔ لیکن جب یہ جذبات اپنی حد سے آگے قدم بڑھاتے ہیں تو فطرت کی بخشی ہوئی ایک شے جو یقیناً نیکی تھی۔ یکایک بدی بن جاتی ہے۔ اور اس کا نام جرم اور گناہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنی اصطلاح میں ہر جگہ معصیت اور گناہ کے لئے (اسراف) کا لفظ اختیار کیا (قل یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لاتقنطوا من رحمۃ اللہ)

ہو جائے گا۔ اسی لئے فرمایا کہ اسراف مت کرو۔ لیکن ایک دوسرے موقع میں صورت خرچ اشیاء سے مختلف تھی۔

وآت ذا القربیٰ حقہ والمساکین وابن السبیل ولا تبذر تبذیرا ہ

اور اقارب کا حق ان کو دو۔ نیز مسکین اور مسافر کے حقوق ادا کرو۔ اور دولت کو بجا مت ضائع کرو

یہاں چونکہ مقصد یہ تھا کہ دولت کا صرف صحیح اعزا و اقارب وغیرہ کے حقوق ادا کرنا ہے۔ پس دوسرے کاموں میں اس کو بے موقع خرچ نہ کرو۔ اس لئے اسراف نہیں کہا بلکہ تبذیر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

رجوع الی المقصود

حاصل سخن یہ ہے کہ گناہ معصیت فسق جرم اور ہر وہ شے جس میں عدل پایا جائے۔ یقیناً نیکی اور عمل خیر ہے۔ قرآن ہر جگہ ہر طرح کے محاسن و فضائل کو اسی جامع و مانع لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی اصطلاح میں صراط المستقیم۔ توازن قسط، میزان الموازین قسطاس المستقیم اور عدم تطفف اور اسی طرح کے بیسیوں الفاظ اسی ایک مقام عدل سے عبارت ہیں۔ وہ ہر جگہ اور ہر تعلیم میں لا تعتدوا (زیادتی مت کرو) اور اعدلوا (عدل کرو) کے اصول کی دعوت دیتا ہے اور اسی راہ کو اقرب الی التقویٰ بتلایا ہے۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ ہر شے میں خواہ وہ اس کی عبادت اور بندگی اور خواہ اس کی راہ میں خیرات و بخشش ہی کیوں نہ ہو یہ ہے۔

ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا

اور اپنا ہاتھ نہ اس طرح سکیڑ لو کہ گویا گردن میں بندھ گیا ہے اور نہ بالکل پھیلا دو

برخلاف (تبذیر) کے کہ اس کی تعریف (صرف الشئ فیما لا ینبغی) بیان کی گئی ہے یعنی "کسی چیز کو اس کے مصرف کے علاوہ دوسری جگہ خرچ کرنا" مثلاً دولت نفس کے ضروری آرام و آسائش، اعزاز و اقارب کی اعانت اور اعمال حسنہ میں خرچ کرنے کے لئے ہے۔ مگر آپ اسے محض اپنی جاہ و نمائش دنیوی عزت اور حکام کی نظروں میں رسوخ حاصل کرنے کے لئے باسمائے مختلفہ لٹانا شروع کر دیں۔ تو قرآن کریم اس کو (تبذیر) سے تعبیر کرے گا اور چونکہ اس کا نقصان اسراف سے شدید تر ہے۔ اس لئے وعید بھی سخت وارد ہوئی۔ کہ مسرف کے لئے تو صرف (ان اللہ لا یحب المسرفین) خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا" فرمایا اور (تبذیر) کے مرتکبین کو (کانوا اخوان الشیاطین) کہہ کر شیطان کے "اخوان و اقارب" میں شمار کیا گیا۔ اسراف اور تبذیر کا یہ فرق خود قرآن کریم سے ماخوذ ہے۔ تفسیر بالرائے نہیں ہے۔ یہ دونوں لفظ جہاں جہاں بولے گئے ہیں اگر ان کا استقصاد کیا جائے۔ تو خود بخود یہ فرق ظاہر ہو جائے گا۔ مثلاً

کلوا واشربوا ولا تسرفوا ان اللہ لا یحب المسرفین ○	کھاؤ اور پیو لیکن اسراف نہ کرو۔ اللہ اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

بھوک اور پیاس میں غذا اور پانی کا صرف، ایک بالکل صحیح مصرف کا خرچ ہے۔ اور اشیاء کا بے موقع خرچ کرنا نہیں ہے۔ غذا کھانے ہی کیلئے ہے اور پانی پینے ہی کے لئے لیکن اگر حد خواہش اور ضرورت سے زیادہ کھایا جائے یا ان کی طیاری اور طریق اکل و شرب میں بے جا روپیہ خرچ کیا جائے تو یہ اسراف

ویل للمطففین (۸۳: ۱)   ماپ تول میں کم دینے والوں کے لئے بڑی تباہی ہے۔

عدل کے لئے سب سے زیادہ مشاہدے میں آنے والی اور عام فہم مثال ترازو کی تھی۔ کہ اس کے تمام اعمال کی صحت کا دارومدار محض اس کے اوپر کی سوئی پر ہے۔ جب تک وہ ٹھیک ٹھیک اپنے وسط میں قائم نہ ہو جائے وزن کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ جونہی دونوں پلڑوں کا وزن مساوی ہو گا۔ معاً سوئی بھی وسط میں آ کر ٹھہر جائے گی۔

اسی لئے قرآن نے اکثر مقامات میں ترازو کی مثال سے کام لیا ہے۔ اور قیامت کے دن بھی انسانی اعمال کا فیصلہ اسی کے ہاتھ ہو گا۔

فاما من ثقلت موازینہ فھو فی عیشۃ راضیہ ۰ و اما من خفت موازینہ فامہ ھاویہ یہی سبب ہے کہ وسط کو عدل کے معنوں میں بولا جاتا ہے اور فی الحقیقت (وکذالک جعلنکم امۃ وسطا) میں بھی وسط سے مراد عدل ہی ہے۔

جس جماعت کا فرض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو اس سے بڑھ کر اور کون سی جماعت عند اللہ اور عند الناس عادل ہو سکتی ہے؟ پس خدا تعالٰی نے فرمایا کہ ہم نے تم کو تمام دنیا کے لئے ایک عدل قائم کرنے والی امت بنایا تاکہ دنیا کے لئے ایک گواہ عادل کی حیثیت سے شہادت دے سکو۔

خود قرآن مجید بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ (قال اوسطھم) اور وہاں بلا اختلاف (اوسطھم) سے مراد (اعدلھم) ہی ہے۔

تبسطها کل البسط فتقعد ملوما محسورا (٣٣:١٧)

تم خالی ہاتھ بیٹھے رہ جاؤ گے۔ اور لوگ تم کو ملامت کریں گے۔

ہر کام کے لئے اس آیت میں اعتدال کی ایک جامع مثال بیان کر دی گئی ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے مقصود قیام عدل ہے

پس، جیسا کہ ہم نے ابتدا میں اس طرف اشارہ کیا تھا۔ جس جماعت کا فرض دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو گا۔ وہ دنیا میں ایک ایسی طاقت ہو گی۔ جو صرف نیکی ہی کی خاطر دنیا میں بھیجی گئی ہے، اور چونکہ نیکی عبادت ہے عدل سے اور بدی اس کے عدم سے، اس لئے فی الحقیقت وہ عدل کو قائم رکھنے والی اور افراط و تفریط کو کہ بدی اور گناہ ہے روکنے والی جماعت ہو گی،

اب عدل کی حقیقت پر غور کیجئے تو وہ فی الحقیقت ہر شے کی وسطی اور درمیانی حالت کا نام ہے۔ کسی ایک طرف جھک پڑے۔ اور یہ افراط و تفریط ہے۔ لیکن ٹھیک ٹھیک درمیان میں اس طرح کھڑے رہیئے۔ کہ بال برابر جگہ بھی کسی طرف زیادہ نہ بچی ہو تو اس کا نام اعتدال اور عدل ہو گا۔ کہ قرآن کریم نے اس کی نہایت عمدہ مثال دی ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔

وزنوا بالقسطاس المستقیم ذالک خیر واحسن تاویلا (٣٧ : ١٧)

جب کسی چیز کو تولو، تو ترازو کی ڈنڈی سیدھی رکھو (تاکہ وزن میں دھوکا نہ ہو) یہی طریق خیر اور نیک انجام ہے۔

دوسری جگہ ایک سورت اس جملے سے شروع کی ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف (الخ)	تم سب میں بہتر امت ہو۔ اس لئے کہ نیکی کا حکم دیتے ہو۔ (الخ)

دونوں آیتیں ایک ہی سورت ایک ہی رکوع میں ہیں پھر دونوں میں اختلاف کیوں ہے۔ پہلی میں یہ فرض محدود و مخصوص ہے، اور دوسری میں عام ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ پہلی آیت میں خدا تعالٰے نے جن فرائض کا ذکر کیا ہے ان میں سے ہر فرض اپنی تکمیل کے لئے علم کا محتاج ہے۔ دعوت الی الخیر کے لئے ضروری ہے کہ اعمال خیر کا علم ہو۔ امر بالمعروف کیونکر انجام پاسکے گا۔ جب کہ وہ کام معلوم نہ ہوں گے۔ جن پر معروف کا اطلاق ہو سکتا ہے؟ نہی عن المنکر تو اور زیادہ علم و فرض اور درس اور تدریس کا محتاج ہے۔ کیونکہ منکرات میں تمام محرمات و مکروہات فقیہہ داخل ہیں۔ اور جب تک ان کا علم نہ ہو کیوں کر ان سے روکا جا سکتا ہے۔

اس تفسیر کی بنا پر فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ کہ اس آیت (ولتکن منکم) میں (من) تبعیض کے لئے آیا ہے۔ اس سے صرف ایک گروہ محدود (علماء) مراد ہے، اور یہ تینوں باتیں صرف انہی کے فرائض میں داخل ہیں۔

علماء نے اس فرض عام کو اپنے لئے مخصوص کیا

لیکن درحقیقت یہ خیال عملاً اور اعتقاداً ایک ایسی خطرناک غلطی تھی جس کو نہیں سمجھتا کہ کن لفظوں سے تعبیر کروں؟ اس تیرہ سو برس میں اسلام کو ان تمام غلط فہمیوں سے سابقہ پڑا جو اس سے پہلے امم سابقہ کو پیش آچکی ہیں۔ لیکن کسی سخت سے سخت تحریف نے بھی مسلمانوں کو ایسا لاعلاج نقصان نہیں پہنچایا

امام رازی نے بروایت نقال ایک حدیث بھی درج کی ہے۔ کہ آنحضرت نے خود اس آیت کی یوں تفسیر فرمائی۔ (امۃ وسطا ای عدلا) اس کے علاوہ مشہور حدیث (خیر الامور اوسطھا) میں بھی اوسط بمعنیٰ اعدل استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی بہتر کام وہ ہیں جو ان میں مطابق عدل ہوں۔ آنحضرت کی نسبت کہا جاتا تھا کہ اوسط قریش نسبتاً اور یہاں بھی ظاہر ہے۔ کہ اوسط، اعدال ہی کے معنیٰ میں بولا گیا ہے اور اسی بنا پر اس آیت سے (اجماع کی حجۃ) ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے۔ کہ جب اُمت کی عدالت نص سے ثابت ہو گئی۔ تو اس کا اجماع یقیناً گمراہی وفساد سے محفوظ ہو گا۔

پہلی اور دُوسری آیت میں تطبیق

پہلی اور دُوسری دونوں آیتوں میں خدا تعالےٰ نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فرض کا ذکر کیا ہے لیکن پہلی آیت میں بظاہر الفاظ تمام امت کے لئے نہیں بلکہ امت میں سے ایک جماعت خاص کے لئے اس کا فرض ہونا معلوم ہوتا ہے

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف (الخ)	تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہیئے جو خیر کی طرف بلائے۔ اور نیکی کا حکم دے۔

لیکن دوسری آیت میں کسی ایک جماعت کی تخصیص نہیں ہے۔ تمام اُمت کا امتیاز ملی اسی فرض کو قرار دیا ہے۔

المجرمین۔ ثم جعلنا کم خلائف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون ؟ (۵:۳۵)

نہیں ہوا۔ مجرموں کو ہم ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں پھر ان کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے تم کو دنیا کی بادشاہت دے کر ان کا جانشین بنایا تاکہ دیکھیں کہ کیسے عمل کرتے ہو مگر یہ بدبختی بھی صرف اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

لیکن یہ سب کچھ کیوں کر ہوا۔؟ اسی طرح کہ اعتقاد ہی سے عمل وجود پذیر ہوتا ہے۔ اس غلط فہمی کا پہلا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ (امر بالمعروف) جو دراصل ہر فرد اسلامی کا فرض تھا۔ اور صحابہ کرام کی زندگی اس کی عملی شہادت ہمارے سامنے ہے وہ روز بروز ایک مرکز و دائرے میں سمٹتا گیا اور سمٹتے سمٹتے ایک غیر محسوس نکتہ بن کر رہ گیا۔ اب اس کے وجود میں بھی شک ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب کے انحطاط و ہلاکت کی ایک بڑی علت روساء مذہبی کا معبود انہ اقتدار ہے۔ اسلام نے اس زہر کا تریاق اسی اصل اصول کو تجویز کیا تھا۔ کہ امر بالمعروف کی خدمت کو اس طرح عام، اور ہر فرد ملت پر پھیلا دیا جائے کہ پھر کسی مخصوص گروہ کو اس ذریعہ سے اقتدار حاصل کرنے کا موقع نہ ملے اور ہندوؤں نے برہمنوں اور عیسائیوں کے رومن کیتھولک نادروں کی طرح مذہبی دعوت اور اصلاح کو کوئی جماعت اپنی اقلیم حکمرانی نہ بنائے کہ لعل کا ایشاء دیکھ چاہیے لیکن اب صدیوں سے دیکھیئے۔ تو مسلمان جن بیڑیوں کو کاٹنے آئے تھے۔ اُن سے خود اُن کے پاؤں بوجھل ہو رہے ہیں۔ اس فرض الٰہی کو (علماء) نے اپنا موروثی حق بنا لیا ہے۔ جس میں اور کسی فرد کو دخل دینے کی اجازت نہیں۔ شیطان

جیسا اس غلطی سے پہنچا اور پہنچ رہا ہے۔ اسلام کی وہ دعوتِ الٰہی جو ایک عالمگیر اصلاح اور بین الملی جامعہ کے قیام کے لئے آئی تھی۔ اسی غلط فہمی سے زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی۔ خلافت و نیابت الٰہی کا وہ شرف جو مسلمانوں کو عطا کیا گیا تھا۔ اور جس کی وجہ سے یہ حیثیت ملّی وہ تمام عالم میں خدا کا مقدّس دستِ عمل تھے۔ بدبختانہ اسی غلط فہمی سے خاک میں ملا۔ روسائے روحانی اور پیشوایان مذہب نے جو مشرکانہ اختیارات اپنے لئے مخصوص کر لئے تھے اور جن کی غلامی سے دنیا کو نجات دلانا اس دین الحق کا اصلی مشن تھا۔ اس کی بیڑیاں پھر اسی غلط فہمی کی لعنت سے مسلمانوں کے پاؤں میں پڑیں کہ اب تک نہ نکل سکیں چالیس کروڑ فرزندانِ الٰہی جن کو اپنے اعمال حسنہ سے دنیا میں خدا کی تقدیس کا تختِ جلال بننا تھا۔ آج اپنی تمام بداعمالیوں سے تمام قومی جرائم اور ملّی معاصی میں گرفتار ہیں۔ اور قہر الٰہی کو مدتوں سے دعوت دے رہے ہیں۔ یہ وہی معاصی ہیں جن کی پاداش میں اقوام گزشتہ سے خدا نے اپنا راستہ توڑا تھا۔ جن کی وجہ سے (داؤد) کے بنائے ہوئے ہیکل سے روٹھ کر رحمت الٰہی نے (اسماعیل) کی چُنی ہوئی دیواروں کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ اور پھر جن کی وجہ سے بنی اسرائیل کو اپنی نیابت سے معزول کر کے مسلمانوں کو اس پر سرفراز کیا تھا۔

ولقد اھلکنا القرون من قبلکم لما ظلموا وجاءتھم رسلھم بالبینات وما کانوا لیؤمنوا کذلک نجزی القوم

اور تم سے پہلے کتنی قومیں گزر چکی ہیں۔ کہ جب انہوں نے ظلم و معاصی پر کمر باندھی تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لیکر آتے تھے۔ مگر انہیں ایمان نصیب

غلما نه عسکر۔ ولفلان؛ من اولاد کجند یعنی امیر کے لڑکوں سے فوج کے سپاہی ہیں۔ اور فلاں شخص کی اولاد سے لشکر مرتب ہو رہا ہے۔ تو اس سے امیر کے تمام لڑکے مراد ہوں گے۔ نہ کہ بعض خود قرآن میں ایک موقعہ پر فرمایا ہے۔ کہ فاجتنبوا الرجس من الاوثان ۲۲ (۲۲ : ۳۰) (۲۱ : ۲۲) مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بتوں کے علاوہ اور کسی شے کی ناپاکی سے پرہیز نہ کیا جائے غرض کہ یہاں (من) افادہ معنی تبیُن کرتا ہے نہ کہ تبعیض (امام رازی) نے دوسرے قول کو بیان کرتے ہوئے اس پر کافی بحث کی ہے (فمن شاء التفصیل فلیرجع الیہ (جلد ۲ : ۲۲۸)

لیکن اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ہم قرآن مجید کی ایک اور آیت اس مضمون کے متعلق پیش کرتے ہیں اگر (امام رازی) نے اس آیت کو بھی پیش نظر رکھا ہوتا۔ تو ان کو متعدد آرا اور توجیہات کے لاحاصل نقل کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ سورۂ (حج) کے پانچویں رکوع میں خدا تعالے نے کافروں کے ان مظالم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس سے آغاز اسلام کے مسلمانوں کو سامنا تھا۔ پھر دفاع و حفظ نفس کے لئے قتال کی اجازت دی ہے۔ اور اس کے بعد کہا ہے

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف ونھوا عن المنکر؛ وللہ عاقبۃ الامور (۲۲ : ۴۱)	اگر ہم (ان مظلوم مسلمانوں) کو حکومت اور خلافت دے کر زمین میں قائم کر دیں تو وہ نہایت اچھے کام انجام دیں گے۔ یعنی نماز پڑھیں گے۔ زکوٰۃ دیں گے۔ لوگوں کو اچھے کاموں کا حکم دیں گے۔ اور برائی سے روکیں گے۔ اور سب کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں

(اپنی قدیمی عادت کی طرح) جب ضرورت دیکھتا ہے ان کو اپنے اعمال ابلیسانہ کے لئے آلہ کار بنا لیتا ہے۔ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی جگہ (امر بالمنکر ونہی عن المعروف) کے فرائض ان کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔ باقی تمام قوم اپنے اس فرض کی طرف سے بالکل غافل اور بے خبر ہے اور جہل مذہبی کے سبب سے (علماء) کے اس غصب حقوقِ عامہ پر قانع ہو گئی ہے۔ خدا کی حکومت کوئی بھی اپنے اوپر محسوس نہیں کرتا۔ نیکیوں کی طرف سے سب کی آنکھیں بند ہیں اور برائیوں پر سے ہر شخص اس طرح گذر جاتا ہے۔ گویا اس کو کان سننے کے لئے اور آنکھیں دیکھنے کے لئے ملی ہی نہیں۔ فانها لا تعمی الابصار، ولا تعمی القلوب التی فی الصدور (۲۲-۶۴)

دونوں آیتوں کا منشاء ایک ہے

حقیقت یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں کوئی اختلاف نہیں دونوں کا منشاء ایک ہے۔ اور دونوں اس فرض کو بغیر کسی تخصیص و تحدید کے ہر قائل کلمۂ توحید کا فرض قرار دیتی ہے۔ البتہ پہلی آیت میں (ولتکن منکم) کا لفظ اشتباہ پیدا کرتا ہے کہ (منکم) بیان تبعیض کے لئے ہے، یعنی تم میں سے بعض لوگوں کی ایک جماعت اس فرض کو اپنے ذمہ لے لے۔ لیکن چونکہ آگے چل کر دوسری آیت نے اس فرض میں تمام اُمّت کو شامل کر لیا ہے۔ اس لئے یہاں (منکم) کو تبعیض کے لئے قرار دینا ہی غلط ہے بلکہ وہ یقیناً توضیح و تبیین کے لئے آیا ہے۔ جیسا ہر زبان کے محاورے میں عموماً بولا کرتے ہیں۔ مثلاً عربی میں کہیں گے۔ للامیر من

تعلیم میں یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اعتقاد اور عمل دو مختلف چیزیں ہیں، جو اصول قابلِ عمل نہ ہو، وہ کاغذ کے صفحوں پر کتنا ہی دلفریب ہو۔ مگر انسانی مصائب کے لئے کیا مفید ہو سکتا ہے؟ دیکھنا یہ ہے کہ دنیا اس اصول پر عمل بھی کر سکتی ہے۔ یا نہیں؟

"اسلام" بکسر عمل ہے، مذہبی تاریخ میں جو انقلابات ذہن واصول سے عمل کی جانب ہوئے ہیں اور جن کی ابتدائی حالت مکمل نمونہ دگوتم بدھ) اور آخری صورت (مسیحی تحریک) تھی۔ اسلام اس کے انقلاب آخری کا نام ہے۔ جس کے بعد مذہب ایک خاص عملی قانون کی شکل میں مبدل ہو گیا۔ اور وہ تمام چیزیں نکل گئیں جو اس کی عملی طاقت کو معرفت پہنچاتی تھیں۔ پس اگرچہ سچ ہے کہ امر بالمعروف ایک اسلامی اصول ہے۔ تو یہ بھی سچ ہے کہ وہ محض ایک ذہنی زندگی رکھنے والا اصول ہی نہیں بلکہ انسان کی عملی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے والا قانون ہے۔

حُب و بغض اور عفو و انتقام

سب سے بڑی مشکل جو اس اصول کی عملی راہ میں پیش آتی ہے۔ وہ اخلاقی تعلیمات کی دورنگی ہے، ایک طرف عفو و درگزر اور محبت و عاجزی کی تعلیم ہے۔ دوسری طرف نیکی و بدی کے احتساب کی سختی اور انتقام و عقوبت ہے۔ خود قرآن کریم کی تعلیمات میں بھی یہی مشکل پیش آتی ہے۔ ایک عفو و نرمی اور حکمت و موعظت کا حکم ہے۔ دوسری طرف سختی و انتقام اور تشدد و جبر کے

یہ آیت اس بارے میں بالکل صاف اور فیصلہ کن ہے خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیاب کرنے کی علت یہ بیان کی ہے۔ کہ وہ زمین پر حکمران ہونے کے بعد اچھے اور نیک کاموں کو انجام دیں گے پھر ان کاموں کی بالترتیب تشریح کی ہے اور سب کو مسلسل عطف کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جو معطوف اور معطوف علیہ میں تسویہ ثابت کرتا ہے۔ پہلے نماز کا ذکر کیا پھر زکوٰۃ کا۔ اور یہ دونوں عمل ہر جگہ قرآن میں ایک ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نام آیا ہے۔ اور اسی سلسلۂ اعمال میں، جس میں نماز اور زکوٰۃ بلحیۂ وجوب و فرض بیان کئے جاتے ہیں۔ اس سے ثابت ہو گیا۔ کہ:۔

(۱) مسلمانوں کو خدا نے جو نصرت و فتح اور دنیا میں کامیابی عطا فرمائی۔ اس کی علت یہ تھی کہ تاکہ وہ اعمال حسنہ انجام دیں۔

(۲) وہ اعمال حسنہ (علی الخصوص) قیام نماز، ادائے زکوٰۃ، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہیں۔

(۳) نماز اور زکوٰۃ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ پس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ہر مسلمان کے فرائض میں داخل ہے۔

عمل و اعتقاد

گزشتہ بیان سے گویہ متحقق ہو گیا کہ اسلام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنے ہر پیرو پر فرض کر دیا ہے۔ لیکن اصل بحث ابھی باقی ہے اس تعلیم کو اصولاً و اعتقاداً کون نہیں مانتا۔ لیکن اخلاق اور مذہب کی ہر

کے اوپر بھی ایک قانون عام کی حکومت ہے۔ یعنی " نفع رسانی اور حقوق العباد کی نگہداشت " پس اگر کوئی علّت ایسی پیدا ہو جائے جس کے سبب سے محبّت کی صورت اپنی محبوبیت کو مسخ کر دے۔ تو پھر ہر محبوب شئے کو اپنی نظروں میں مبغوض بنالو، اور جس قدر محبّت کی راہ میں محبت کا جوش رکھتے تھے۔ محبّت ہی کی خاطر بغض کی راہ میں بغض کا جوش ظاہر کرو۔

غور کرو۔ قانون دنیا میں کیا چاہتا ہے؟ محبّت یعنی امن کو قائم کرنا لیکن محبت کی خاطر عداوت، اور امن کی خاطر بدامنی اس کو بھی کرنی پڑتی ہے۔ اس کی انتہائی آرزو یہ ہے کہ انسان کی زندگی کو مہلکات سے نجات دے۔ لیکن زندگی بخشنے کے لئے اسے موت ہی کے حربے سے کام لینا پڑتا ہے۔ انسان کو پھر چڑھا کر مارتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ یہ اس لئے ہے تاکہ انسان گلا گھونٹ کر نہ مارے جائیں۔

پارلیمنٹ اور جمہوریت امن اور آزادی مانگتی ہے۔ مگر امن کی خاطر اُسے شخصی حکومت میں بدامنی پیدا کرنی پڑتی ہے۔ اور آئندہ قتل روک دینے کے لئے بہتوں کو قتل کرنا پڑتا ہے۔

قرآن نے حب و بغض اور نرمی و سختی کے اصول کو اسی بنیاد پر قائم کیا ہے اس کی عام تعلیم یہ ہے۔

خذ العفو وامر بالمعروف	خطاؤں سے درگزر کر اچھی باتوں کا حکم دے
واعرض عن الجاهلين و	اور جاہلوں سے کنارہ کش ہوجا اور اگر
اما ينزغنك من الشيطان نزغ فاستعذ بالله انه سميع عليم	(اے پیغمبر) خدا سے پناہ مانگ، وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

احکام پر زور دیا گیا ہے۔ یورپ کے مورخین جب تعصب و جہل کی تاریکی میں اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو اس اختلاف کی تہہ میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر پریشان ہو کر اس اختلاف کو (مکی) اور (مدنی) زندگی کے اختلاف حالت کا نتیجہ بتلاتے ہیں۔ کہ جب تک اسلام بے بسی اور محتاجی کی حالت میں تھا نرمی اور عفو درگزر کی تعلیم سے زندگی کا سہارا ڈھونڈتا تھا۔ لیکن مدینہ میں آ کر جب تلوار ہاتھ آ گئی تو پھر حکومت اور طاقت کی حالت میں عاجزی و مسکنت کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن واللہ یعلم انہم لکاذبون ٥

عفو و انتقام کا اصل اصول

اس بحث کا یہ موقع نہیں لیکن اسلام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو جس اصول پر قائم کیا ہے۔ اور وہ حسب ذیل ہے۔

فقہا کا ایک عمدہ اصول ہے کہ " اصل ہر شئے کی اباحت ہے تا آنکہ کوئی سبب حرمت پیدا نہ ہو۔" انگور کا عرق فی نفسہٖ ایک مفید اور عمدہ شے ہے لیکن جب اس میں نشہ پیدا کر دیا جائے۔ اور نشہ کی وجہ سے انسان کے دماغ اور اخلاق کو نقصان اور اس نقصان کی وجہ سے امن عامہ میں خلل اور سوسائٹی کا ہرج ہو۔ تو وہ پھر حرام قطعی ہے۔

بالکل اسی طرح اخلاق میں بھی اصل عمل (محبت) ہے تا آنکہ کوئی سبب لاحق ہو کر (بغض) سے تبدیل نہ کر دے۔ یعنی دنیا میں ہر شے محبت کے زیر قانون ہے اور کوئی نہیں جو محبت و پیار کا مستحق نہ ہو۔ لیکن اس محبت

ولمن صبر و غفر، ان ذالك لمن عزم الامور (۴۲ : ۴۳) | اور جو صبر کرے اور خطاؤں کو بخش دے۔ تو بیشک یہ بڑے ہمّت کے کام ہیں۔

احسان عام کی ان تعلیمات کا استقصا کیا جائے تو اس طرح کی بیسیوں آیتیں اور ہیں گی۔ یہ تعلیم گویا عام، اور گویا اصل اخلاقی کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن جب عوارض سے حالات متغیر ہو جائیں۔ اور عفو و درگزر کی جو علّت تھی۔ دلیعنی نفع خلائق اور عدم مضرت رسانی، عفو درگزر سے خود وہ مفقود ہونے لگے۔ تو اس حالت میں پھر بہ شرائط عدل و وسطیت، انتقام اور بدلے کی سختی کو جائز کر دیا۔

جزاء سیئة، سیئة مثلها (۴۲ : ۳۸) | برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی سے کرو۔

آگے چل کر اس کو صاف کر دیا۔

ولمن انتصر بعد ظلمه فاولئك ما علیهم من سبیل، انما السبیل عن الذین یظلمون الناس و یبغون علی الارض بغیر الحق (۴۲ : ۳۹) | اور اگر کسی پر ظلم ہوا ہو اور وہ اُس کے بعد بدلہ لے تو ایسے لوگ معذور ہیں۔ ان پر کوئی الزام نہیں۔ الزام انہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور بغیر کسی حق کے زیادتی کے ساتھ پیش آئے ہیں

دوسری مثال اس سے زیادہ واضح ہے۔

عام حکم کفار و مخالفین کے ساتھ نرمی و رافت، عفو و درگزر اور بطریق احسن نصیحت و مواعظت کا ہے

ادع الی سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن (۱۶ : ۸۷) | خدا کی راہ کی طرف حکمت و وعظ کے ساتھ بلاؤ اور اگر بحث بھی کرو تو اس طرح کہ وہ پسندیدہ طریقہ ہو۔

دوسری جگہ مخصوص طور پر یہود و نصاریٰ کی نسبت کہا۔

ایک دوسرے موقع پر احسان عام عاجزی و فروتنی کو اس پیرایہ میں فرمایا

ولا تمش فی الارض مرحا انک لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولا کل ذلک کان سیئۃ عند ربک مکروھا ۔ (۱۷ : ۴)

زمین پر اکڑ کے نہ چلا کرو، اس طرح چل کر زمین کو پھاڑ تو سکتے نہیں۔ اور نہ تن کر چلنے سے پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکتے ہو۔ یہ تمام باتیں خدا کو ناپسند ہیں۔

سورۂ فرقان میں اپنے نیک بندوں اور سچے مومنوں کی جہاں خصلتیں گنائی ہیں۔ وہاں پہلا وصف یہ ہے۔

وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما (۲۵ : ۶۵)

اور رحم کرنے والے خدا کے رحم طینت بندے وہ ہیں جو زمین پر نہایت فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور جب جاہل ان سے جہالت کی باتیں کرتے ہیں۔ تو سلام کرکے الگ ہو جاتے ہیں۔

سورۂ شوریٰ میں ایک ایسے موقعہ پر مومن کا سب سے بڑا وصف یہ قرار دیا ہے۔ کہ :-

اذا ما غضبوا ھم یغفرون (۳۱۴۲)

اور جب ان کو غصہ آجاتا ہے۔ تو خطا ئیں بخشتے درگذر کرتے ہیں۔

اصطلاح قرآن میں (عزم امور) ایک انتہائی وصف ہے جو انبیائے جلیل القدر کی مدح میں آیا ہے۔ لیکن عفو و صبر کرنے والے کے لئے بھی اسی کو استعمال کیا۔

الفتنة اشد من القتل (۲:۱۹۱)	فساد خونریزی سے بڑھ کر برائی ہے۔

(۲)

وقاتلوا هم حتی لاتکون فتنة (۲:۱۸۹)	ان کو قتل کرو۔ یہاں تک کہ ملک میں فساد باقی نہ رہے۔

جس طرح قانون قتل کی برائی کو روکنے کے لئے خود قتل کی برائی کو مجبوراً اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن نے فتنہ و فساد سے ارض الہٰی کو پاک کرنے کے لئے تلوار سے مدد لینے تک کی اجازت دے دی ہے بیشک نرمی اور نرم رفتاری کو خدا دوست رکھتا ہے۔ لیکن سخت گیروں اور ظالموں کو سختی سے باز رکھنے کے لئے جب تک سختی نہ کی جائے۔ نرمی قائم نہیں ہو سکتی۔ فتنہ و فساد سے پسند نہیں۔ مگر فتنہ و فساد کو روکنے ہی کے لئے اسے فتنہ سے علاج بالمثل کرنا پڑتا ہے۔

ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع و بیع والصلوات ومساجد یذکر فیها اسم الله کثیراً۔ (۲۲:۴۲)	اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ سے نہ ہٹواتا رہتا تو تمام صومعے اور گرجے اور تمام عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے کبھی کی منہدم ہو گئی ہوتیں۔

یعنی مقصد الہٰی شفقت و رحمت و احسان عام ہے۔ لیکن جب ایک گروہ اس کی زمین کو فتنہ و فساد سے آلودہ کرتا ہے) بغیر کسی جرم و قصور کے محض

ولا تجادلوا اهل الکتاب الا بالتی ھی احسن (۲۹ : ۴۵)	اہل کتاب کے ساتھ بحث نہ کرو۔ مگر بطریق پسندیدہ

لیکن پھر دوسرے موقعوں پر جہاد فی سبیل اللہ کو ایک فرض دین قرار دیا اور سورتوں کی سورتیں اس کے احکام کی نسبت نازل فرمائی۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (۲ : ۱۸۷)	جو لوگ تم سے لڑیں تم بھی اللہ کی راہ میں ان سے قتال کرو۔

اسی آیت کے بعد فرمایا۔

فاقتلوھم حیث ثقفتموھم و اخرجوھم من حیث اخرجوکم (۲ : ۱۸۸)	ان کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ اور جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے۔ تم بھی انہیں نکال باہر کرو۔

پہلے عام طور پر نرمی اور آشتی کا حکم دیا تھا۔ لیکن قتل پر بھی بس نہ کر کے اب شدید سے شدید سختی پر زور دیا حیث قال

قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ۔ ولیجدوا فیکم غلظۃ	اپنے آس پاس کے کافروں سے لڑو۔ اور چاہیے۔ کہ وہ تم میں سختی پائیں

دونوں تعلیموں میں کس درجہ تباین و تناقض ہے؟ مگر دراصل دونوں کا منشاء ایک ہی ہے۔ پہلا حکم احسان عام، محبت عمومی اور اصل اخلاقی پر مبنی تھا لیکن جب عوارض و لواحق سے حالات بدل گئے۔ تو جس طرح پہلے انسانوں کی راحت اور جلب نفع کے لئے نرمی کا حکم دیا تھا۔ اسی طرح اسی مقصد سے یہاں سختی و قتل کا حکم دیا۔ اور اس کی علت کو کھول کر بیان کر دیا۔

تم بھی ذلیل کرو۔ تاکہ تسویہ و اعتدال پیدا ہو؟ یہ سب کچھ عین رحم و محبت ہے۔ نہ کہ سختی و جبر ڈاکٹر مریض کے عزیز سے کم مریض پر مہربان نہیں اس کے تلوے میں کانٹا چبھ کر چبھن پیدا کر رہا ہے۔ لیکن اس چبھن کے دور کرنے کے لئے نشتر کی چبھن ہی سے اُسے کام لینا پڑے گا۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات و انزلنا معہم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ باس شدید و منافع للناس (۵۷ : ۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ مبعوث کیا۔ اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو بھیجا۔ تاکہ عدل و انصاف پر قائم ہوں۔ اور نیز لوہا پیدا کیا جو (ہتھیاروں کی شکل میں) سخت خطرناک بھی ہے اور ساتھ ہی بہت سی منفعتیں بھی انسانوں کے لئے اپنے اندر رکھتا ہے۔

اس آیت میں قرآن نے پوری تشریح کے ساتھ نظام عام کے قوانین اساسی کو بیان کر دیا ہے۔ خدا ہدایت و اصلاح کے لئے انبیاء کو بھیجتا ہے اور ان کو میزان (نظام عدل کی نافذانہ قوت) دیتا ہے۔ تاکہ دنیا میں اللہ کے عدل کو قائم کر دیں۔ لیکن چونکہ اس کے لئے جنگ قہر و عقوبت کی ضرورت ہے۔ اس لئے ان کو عدل قائم کرنے کے لئے جنگ و قتال کی بھی اجازت دی، اور لوہا پیدا کیا جو طرح طرح کے ہتھیاروں کی اشکال اختیار کرتا ہے۔ پس وہ مضر بھی ہے۔ اور مفید بھی۔

عبادت الٰہی کی وجہ سے اس کے نیک بندوں پر سختی کرتا ہے۔ ان کو گھروں سے نکالتا ہے۔ اللہ کی عبادت گاہ میں جانے سے روکتا ہے۔ پھر وہ جب اپنا گھر بار چھوڑ کر، وطن سے بے وطن ہو کر ایک دوسرے شہر میں پناہ لیتے ہیں۔ تو وہاں بھی اگر چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ تو ان حالتوں میں مجبور ہو کر پیغمبر کو فتنہ روکنے، مظلوموں کو بچانے شعائر الٰہی کی حفاظت اور حرمت کو قائم رکھنے اور رافت و رحمت سے دنیا کی محرومی کو مٹانے کے لئے سختی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور تلوار کو کاٹنے کے لئے تلوار بلند کی جاتی ہے۔

وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطا

اس موقعہ پر گزشتہ بیان کے اس حصے پر ایک نظر ڈال لینی چاہیئے جس میں "امۃ" وسطاً پر بحث کی گئی ہے۔ خدا تعالےٰ نے مسلمانوں کو اپنی خلافت اور نیابت بخشی تھی۔ پس ضرور تھا۔ کہ وہ بھی صفات الٰہی سے متصف، اور متخلق باخلاق الٰہی ہوں۔ خدا رحیم اور محبّت کرنے والا ہے۔ پس حکم دیا گیا کہ ارحموا علی الارض یرحمکم من فی السماء" ——— زمین پر رحم کرو تاکہ وہ جو آسمان پر ہے۔ تم پر رحم کرے۔ لیکن رحیم ہونے کے ساتھ وہ عادل بھی ہے۔ پس رحم و محبت میں بھی عدل اور وسط کا ہونا ناگزیر تھا۔ اس بنا پر تعلیم دی گئی۔ کہ جب افراط و تفریط حد سے بڑھ جائے تو افراط کو روکنے کے لئے تم بھی افراط کرو۔ صفرا بڑھ گیا ہے۔ تو تم بھی بہت زیادہ ترشی کھلا دو۔ تم پر تلوار اٹھائی گئی ہے۔ تو اسے تلوار ہی سے کاٹو۔ تم ذلیل کئے گئے ہو تو

کو قابل عقوبت ثابت کرنے کے لئے تمام ابن آدم کو نہ سہی، مگر اپنے عزیز بیٹے کو تو تین دن تک لعنت میں گرفتار رکھ کر خونی مجرموں کی طرح سولی پہ چڑھانا ہی پڑا۔

یہ ناگزیر ہے، دنیا کے لئے محبت کی صورت موہنی ہو، مگر افسوس کہ سود مند نہیں۔ عدل کی پیشانی پر اگرچہ خوشنمائی کی بلندی کی جگہ سختی و خشونت کی لکیریں ہیں۔ لیکن دنیا کا تمام نظام صرف اسی کے دم سے ہے۔ پس خدا نے اپنی ملت کو بھی اپنے صفات کی دعوت دی۔ اور اپنی شان عدل کی طرح اس کو بھی (امۃ وسطاً) قرار دیا تاکہ وہ اس کی زمین پر ایک عادلانہ خلافت ہو اور اس کی طرح کسی جذبے میں نہ تو اسراف کرے۔ (یعنی رحم کے موقعہ پہ رحم کو، اور سختی کے موقعہ پر سختی کو اس کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا) اور نہ تبذیر کا طریقہ اختیار کرے۔ (یعنی رحم کی جگہ قہر اور قہر کی جگہ رحم)

مقام محبت الٰہی اور "یحبہم ویحبونہ"

یہی راز ہے کہ خدا نے تمام قوموں کو اپنے اپنے دور میں اپنی خلافت بخشی اور ہر صالحہ جماعت کو اس وراثۃ الٰہی کا حق دار بنایا۔ (ان الارض یرثھا عبادی الصالحون) مگر کسی کو اپنی محبوبیت اور معشوقیت کا درجہ عطا نہیں فرمایا۔ حضرت داؤد (علی نبینا وعلیہ السلام) کی نسبت ضرور کہا کہ

یا داؤد! انّا جعلناک خلیفۃ فی الارض (۳۸: ۲۶) — اے داؤد! ہم نے تم کو زمین پر اپنی خلافت بخشی۔

تشبہ باللہ و تخلق باخلاق اللہ

پس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی صفات الٰہیہ میں سے ایک صفت ہے۔ اسلام انسان کے آگے ایک ارتقائے روحانی کی راہ کھولتا ہے۔ جو کہ عبدیت کے مقام تذلّل و تکسر سے شروع ہوتی ہے۔ مگر اس کا انتہائی نقطہ تشبہ بالالٰہ (یعنی خدا کی صفات سے مشابہت پیدا کرنے کا مقام ہے۔ اور اسی طرف اس مشہور حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے کہ۔ تخلقوا باخلاق اللّٰہ (خدا کا اخلاق اپنے اندر پیدا کرو) پس ضرور تھا کہ جس ملّت کو خدا نے دنیا میں اپنی نیابت اور خلافت بخشی ہے۔ وہ بھی اس صفت الٰہی سے متصف ہوتی۔ خدا اطاعت و عبادت (یعنی ہر ایسے کام سے جو قوائے فطریہ کا صحیح استعمال ہو۔) خوش ہوتا ہے پس ایک انسان مومن کو بھی خوش ہونا چاہیئے۔ خدا کفر و ضلالت اور بد اعمالی سے (یعنی ان تمام کاموں سے جو قوائے فطریہ کا اسراف و تبذیر ہوں) ناخوش ہوتا ہے۔ اور اپنی نارضامندی کا اظہار کرتا ہے۔ پس مومن و مسلم کو بھی ناخوش ہونا چاہیئے۔ اور اپنی نارضامندی کا اعلان کرنا چاہیئے۔ ہم نے گزشتہ بیان میں (اسراف) اور (تبذیر) کی حقیقت سے بحث کی تھی۔ خدا عادل ہے۔ اور رحم و محبت، نرمی و آشتی میں بھی اسراف و تبذیر پسند نہیں کرتا۔ اگر (بائبل) کا (ابن اللہ) رحم محض کا مجسمہ ہے۔ اور عدل کے ترازو کو ہاتھ میں لینا نہیں چاہتا تو نہ لے، مگر چھوڑے بغیر تو اسے بھی چارہ نہیں۔ اُس نے تمام انسانی جرائم و معاصی کو شان محبت کے جوش میں معاف کر دینا چاہا۔ لیکن پھر بھی بدی

اسی کا نتیجہ تھا۔ کہ زلیخا جو کچھ کرتی تھی اپنے نفس کی خاطر کرتی تھی، یوسف کی رضا جوئی مطلوب نہ تھی۔ جب عزیزِ مصر پر اصلیت منکشف ہو گئی۔ تو ذلت و رسوائی سے بچنے کے لئے باوجود کمال استیلائے محبت و شفقت خود ہی یہ صلاح دی کہ :-

مَاجزآءُ من اراد باھلك سوءً ! الاان یسجن اوعذاب الیم۔ (۲:۱۲)

جو شخص تیری بیوی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کرے اس کی یہی سزا ہے کہ قید کیا جائے یا سخت عذاب میں گرفتار ہو۔

لیکن عشق و خود پرستی دونوں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ عشق کی تعریف یہ ہے کہ "اولھا قتل و آخرھا حرق" (اس کی ابتدا قتل نفس ہے اور انتہا تمام خواہشوں اور ہوا و ہوس کا فنا) یہاں سب سے بڑی معصیت اپنے وجود کا حس اور اثبات ہے۔

وجودک ذنب لایقاس بہ ذنب

محبت کا اصلی مقام وہ ہے۔ جہاں پہنچ کر نفس اپنے کو فنا کر دیتا ہے۔ اور پھر دست محبوب میں ایک آلۂ بے روح بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کا دل اس کے پہلو میں نہیں ہوتا۔ بلکہ محبوب کی انگلیوں میں "یقلبھا کیف یشآء" (جس طرف چاہتا ہے پھرا دیتا ہے۔) محبت کا استغراق خود اس کو محبوب کے صفات و خصائل کا ایک دوسرا پیکر بنا دیتا ہے وہ دیکھتا ہے تو اسی کی نظر سے اور سنتا ہے۔ تو اسی کے کانوں سے خود اس کی کوئی خواہش اور کوئی مرضی باقی نہیں

بنی اسرائیل بھی مدتوں اس پہ سرفراز رہے۔ لیکن ان کی نسبت یہ کہیں نہیں کہا کہ وہ خدا کے دوست اور محبوب بنائے گئے تھے۔ یہ اس امت مرحومہ کی مزیت خصوصی تھی کہ :۔

فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ (۵ : ۵۹)	عنقریب اللہ ایک ایسا گروہ پیدا کرے گا جن کو وہ اپنا محبوب بنائیگا اور وہ خدا کو رکھیں گے

لیکن اس ملامت کی علامت یہ بتلائی کہ :۔

اذلۃ علی المومنین، اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم (۵ : ۶۵)	مومنوں کے ساتھ نرم، مگر کافروں کے ساتھ سخت اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑا دیں گے اور کسی کی علامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہ کھائیں گے۔

یہ مختصر آیت اس مشکل کا پورا حل ہے۔ مومن محبوب الٰہی ہے۔ کیوں کہ ایمان باللہ سے بڑھ کر محبت الٰہی کے لئے اور کون سی شے جالب ہو سکتی ہے ؟ لیکن خدا نے اپنی محبت کے ساتھ طرف مقابل کی محبت کا بھی ذکر کیا کہ "میں انہیں چاہتا ہوں۔ اور وہ مجھے چاہتے ہیں" (یحبھم ویحبونہ) اور یہاں ارباب ذوق کے لئے ایک نکتہ عجیب ہے۔ حضرت (یوسف علیہ السلام) کے حالات میں یکسر عشق و محبت ہی کا افسانہ ہے۔ مگر وہ محبت محض یک طرفہ تھی "قد شغفھا حبہ (۱۲ : ۱۳)"، کی طرح دونوں طرف سے نہ تھی صرف زلیخا ہی کی نسبت فرمایا۔ کہ :۔

قد شغفھا حبہ - (۱۲ : ۱۳) یوسف کا عشق اسکے دلمیں جگہ پکڑ گیا ہے۔

الحُبّ فی اللہ والبغض فی اللہ

پس جب مقام ایمان محبّت الہٰی، اور محبّت بغیر حصول فنا فی المحبوب محال تو یہیں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض بے نقاب ہو جاتا ہے۔ (مومن) کی تعریف یہ ہے۔ کہ خود اس کی نہ کسی کے ساتھ دوستی ہو اور نہ دشمنی، نہ کسی کی مدح کرے اور نہ مذمت، بلکہ وہ دستِ الٰہی میں ایک بے جان آلہ بن کر اپنی محبّت اور دشمنی کو راہِ محبوب کے لئے وقف کر دے جو خدا کے دوست ہیں وہ اس کے دوست ہوں۔ اور جو اس کے دشمن ہیں۔ وہ اس کے دشمن ہوں، اسی کی راہ میں دشمنی احب فی اللہ والبغض فی اللہ خدا نیکی اور اعمالِ حسنہ سے خوش ہوتا ہے۔ پس یہ بھی جہاں کہیں نیکی کو دیکھے اپنا سر جھکا دے۔ وہ بدی اور بد اعمال پر غضب ناک ہوتا ہے۔ (لا یرضی لعبادہ الکفر) پس اس کو بھی جہاں کہیں بدی نظر آئے۔ صفاتِ الٰہی کی چادر اوڑھ کر قہر مجسّم بن جائے۔ اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین۔ نیکی کے سامنے جس قدر عاجز ہو اتنا ہی بدی کے آگے مغرور سخت ہو۔

کیا نہیں دیکھتے کہ خدا تعالےٰ نے جہاں امر بالمعروف کا ذکر کیا ہے۔ وہاں ساتھ ہی ایمان باللہ کا بھی نام لیا ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس، تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر وتومنون باللہ

تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو کہ نیک کاموں کا حکم دیتے ہو۔ اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

رہتی۔ محبوب کی خواہش اس کی خواہش اور محبوب کی مرضی اسکی مرضی بن جاتی ہے (زلیخا) کو ابھی یہ درجہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ ورنہ اپنی ذلّت اور رسوائی کے خوف سے (یوسف) کو بارہ برس تک قید خانہ میں نہ دیکھتی۔ البتہ جب اس راہ میں ترقی کر گئی تو پھر ننگ و ناموس نفس کی زنجیریں خود بخود ٹوٹ گئیں اور پکار پکار کر کہنے لگی۔

مَآ اُبری نفسی اِن النفس الامارۃ بالسوء (۱۲:۳۵)	اپنے نفس کو الزام سے نہیں بچاتی بشیک میرا نفس برائی پر آمادہ کرنے والا ہے۔

خدا نے اپنے مومن بندوں کو صرف اپنا ہی محبوب نہ کہا۔ کہ یہ تو صرف زلیخا ہوئی۔ بلکہ یحبھم و یحبونہ فرمایا کہ میں اگر ان کو دوست رکھتا ہوں۔ تو وہ بھی مجھ کو محبوب رکھتے ہیں۔ اس تعلق کو محب و محبوبی اور عشق و معشوقی دونوں سے مرکب بنایا تاکہ مقام ایمان کی اصلی علامت اور خصوصیت ظاہر ہو جائے، اور ایمان باللہ فی الحقیقت اللہ کی محبت ہی کا نام ہے۔

والذین اٰمنوا، اشد حبًا لِلّٰہِ (۲:۸۸)	اور جو لوگ ایمان لائے ہیں۔ ان کی خدا سے نہایت درجہ محبّت ہے۔

محبّت کی شرط اولین فنا فی المحبوب ہے۔ اس لئے مومن مخلص بھی وہی ہے۔ جو تمام اپنی خواہشوں اور قوتوں کو بھول کر صرف خدا کی مرضی اور ارادے پر اپنے تئیں چھوڑ دے۔ خدا کی مرضی، اس کی مرضی اور خدا کی خوشی اس کی خوشی ہو یہی معنی خلافت الٰہی کے ہیں کہ وہ دنیا میں اللہ کی صفات کاملہ کا مظہر اور اس لئے اس کا جانشین ہے۔

چھوڑ دے۔ خود اس کی کوئی ذاتی محبت اور ذاتی عداوت نہ ہو، نہ اپنی غرض کے لئے دوست بنے اور نہ اپنی غرض کے لئے دشمن، وہ ہر شے کو خدا کی آنکھ سے پیار کرے اور اس کی آنکھ سے دشمن دیکھے۔ اس کا کوئی وجود، اس کی کوئی زندگی اس کی کوئی صدا نہ ہو۔ جب چلے تو خدا کے پاؤں سے چلے اور جب سنے تو خدا کے کان سے سُنے۔ اور جب بولے۔ تو خدا کی آواز اس کے گلے سے نکلے۔ ولنعم ما قیل فی ھذا المقام

من بجاناں زندہ ام وز جاں نیستم
من ز جاں بگذشتم و جاناں نیستم
چشم و گوش و دست و پائم او گرفت
من بدر رفتم سرائم او گرفت
ایں بصر ویں سمع، چوں آلاتِ اوست
بلکہ ذراتِ تنم مراتِ اوست
نغمہ از نائیست انے از نے، بداں،
مستی از ساقی ست نے از مے بداں
چوں مرادیدی، خدارا دیدۂ
گردِ کعبہ صدق بر گردیدۂ
گفتنِ من گفتنِ اللہ بود،
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود
ما چو مست از دیدنِ ساقی شدیم
مست گشتیم، از فنا باقی شدیم

یہ اس لئے کہا کہ امر بالمعروف کا فرض بغیر کامل ایمان باللہ کے ادا نہیں ہو سکتا۔ ایک انسان جو ہوائے نفس میں گرفتار ہے۔ درہم و دنانیر کو پوجتا ہے لذت نفس اور عیش دنیوی کو اپنا قبلہ بنا لیا ہے۔ و دنیوی رسوخ و عزت کو اپنا معبود سمجھتا ہے، ممکن نہیں کہ اپنے اندر نیکی کے حکم ا اور بدی کی روک کی طاقت پا سکے۔ وہ مشرک ہے۔ گو زبان سے دعوئی ایمان کرتا ہو۔ مگر ایمان کی حلاوت اس کو کبھی چکھنا بھی نصیب نہیں ہوئی۔

وَمَا یُؤمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَهُمْ مُشْرِکُوْنَ (۲۵ : ۱۹)	اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ گو ایمان کا دعوی کرتے ہیں مگر فی الحقیقت مبتلائے شرک ہیں

عبادت اور بندگی کے معنی کسی مجسم بت کو پوجنا ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہر شے جس کے لینے کا حق صرف خدا ہی کو تھا، اگر اس کے سوا کسی دوسری ہستی کو دے دی جائے۔ تو یہ بھی شرک ہے (مگر اس کی تشریح کا یہ موقع نہیں)

خدا نے سب کچھ انسان کے لئے مگر انسان کو اپنے لئے بنایا۔ پس ایمان باللہ کے یہ معنی ہیں کہ انسان سب کچھ اوروں کو دے دے مگر خود اپنے تئیں خدا کے سوا اور کسی کو نہ دے۔ اگر وہ اپنی خواہش اور مرضی کو اس کی خواہش اور مرضی پر مقدم رکھتا ہے۔ تو وہ دعوئے ایمان میں سچا نہیں۔

ہجوم خیالات سے سلسلۂ سخن بار بار ٹوٹتا ہے، اور پھر چند قدم چل کر واپس ہونا پڑتا ہے۔ حاصل سخن یہ ہے۔ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وہی کر سکتا ہے جو ایمان باللہ میں راسخ و مستقیم ہو اور یہ جب ہو سکتا ہے کہ محبت الٰہی کی راہ میں مستقیم ہو کر سب کو خدا کے لئے اختیار کرے۔ اور سب کو خدا کے لئے

اللہ کا تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ (۴۸: ۱۰) وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (۸ : ۱۸) وررای ذالک، فلا اقول، لا تتی سر، لسان النطق عنه اخرس۔

وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا (۴ : ۷۱)

اور جو لوگ ہر طرف سے باغی ہو کر صرف اللہ اور اُس کے رسول کے مطیع و منقاد ہو گئے۔ تو بیشک وہ ان مقربان الٰہی کے ساتھی ہو جائیں گے۔ جن کو حق تعالےٰ نے اپنی نعمتوں کے نزول کے لئے دنیا میں چن لیا ہے۔ اور جن میں سب سے پہلی جماعت انبیاء کرام کی پھر صدیقوں کی پھر شہداء اور صالحین کی امت کی ہے۔ یہ چار جماعتیں ان کی ساتھی ہوں گی، اور اس رفاقت سے بڑھ کر اور کون سی رفاقت ہو سکتی ہے؟

اس آیت میں چار مخصوص جماعتوں کا ذکر کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی وہ ان کے ساتھیوں میں محسوب ہوں گے۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ "مقام اطاعت" کا حصول کیوں کر متحقق ہو سکتا ہے۔ اور اس کے شرائط کیا ہیں۔

یاد رہے کہ اطاعت کے لئے ایک سرکشی، ہر وفاداری کے لئے ایک دشمنی اور ہر عاجزی کے لئے ایک غرور و تمرّد لازمی ہے۔ آپ ایک آقا کے نوکر

یہ (عارف رومی) کی مستانہ نغمہ پروازیاں ہی نہیں (بلکہ عین ترجمہ ہے اس مشہور حدیث قدسی کا، جس کو (امام بخاری) کتاب التواضع میں لائے ہیں کہ :-

لا یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببته فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بها ورجله التی یمشی بها ولسانه الذی یتکلم به ولئن سألنی لاعطینه ولئن استعاذنی لاعیذنه

جب میرا کوئی بندہ بذریعہ نوافل کے مجھ سے قریب ہوتا ہے۔ تو اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں۔ پس جب وہ محبوب بن گیا تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں۔ میرے کان سے سنتا ہے۔ اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں میری آنکھ سے دیکھتا ہے اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں میرے پاؤں سے چلتا ہے اور اس کی زبان ہو جاتا ہوں میری زبان سے بولتا ہے، وہ جو مانگتا ہے عطا کرتا ہوں۔ اور جب پناہ مانگتا ہے پناہ دیتا ہے۔

" یحبهم ویحبونه " کا یہی مقام ہے۔ اور یہیں پہنچ کر (میر ہرات) اپنی فریاد ضبط نہ کر سکا۔ اور مضطربانہ چیخ اٹھا۔ کہ خدایا این چہ بوالعجبی ست کہ با دوستانِ خودمی کنی ؟ تا وقتیکہ ترا می جستیم، خود را یافتیم، اکنوں خود را می جوئیم۔ ترا می یابیم !"

صحابہ کی جماعت نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر محمد بن عبد اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ مگر ارشاد الٰہی ہوا کہ وہ ہاتھ عبد اللہ کا نہ تھا۔ بلکہ خود

جب تک اس قوت اور اس قوت کے تمام مظاہر سے باغی و منمرد نہ ہو جائے
سب سے بڑی قوت ابلیسی کا مظہر نفس انسانی اور قوائے بہیمیہ کی قوائے ملکوتیہ
سے ایک دائمی جنگ ہے پھر انسان سے باہر طرح طرح کی ضلالتوں اور باطل
پرستیوں کے تخت بچھے ہوئے ہیں۔ اور خود انسانوں کے بیشمار غول ہیں جنہوں
نے شیطان کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس طرح اس کی اطاعت میں اپنے تئیں
فنا کر دیا ہے۔ اور ان کا وجود از سرتا پا پیکر شیطانی اور مجسمہ ابلیسی بن گیا ہے۔ ان
میں سے ہر قوت شیطانی کو اپنے آگے مرعوب دیکھنا چاہتی ہے۔ کہیں دولت
اور مال و جاہ دنیوی شیطان کا نشیمن ہے۔ کہیں غرور علم و فضل کے اندر سے
شیطان جھانک رہا ہے کہیں مذہبی پیشواؤں کی جماعتیں اس کا مرکب فساد بن
گئی ہیں اور کہیں جماعتی تسلط اور قوت نے اپنی دعوت ضلالت کی باگ اس
کے ہاتھ میں دے دی ہے حکومتوں اور گورنمنٹوں کا فرط استبداد بھی ایک بہت بڑا
مظہر ابلیس ہے۔ اور ترک دنا موس دنیوی اور محبت اہل و عیال کی زنجیروں کے
اندر بھی اسی کے تعبد و انقیاد کی کشش مخفی ہے۔ پس مقام "ومن یطع اللہ والرسول"
کے حاصل کرنے کے لئے اولیں شرط یہ ہے۔ کہ انسان ان تمام طاقتوں کی اطاعت
سے یکسر باغی و سرکش ہو جائے اور ان کی عظمت و جبروت کے اثر سے اپنے دل
کو آزاد کر دے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جہاں تک طلب صادق کی قوتیں اور توفیق
الٰہی کی ہمت اس کا ساتھ دے۔ ان تمام مظاہر شیطانیہ کے مقابلہ میں ایک مغرورانہ
جہاد کا اعلان کر دے۔ اور تعبد الٰہی کی تلوار لے کر فاتحانہ اٹھ کھڑا ہو۔ ضلالت
اور گمراہی کا بت کدہ جہاں دیکھے حق اور صداقت کی ضرب سے پاش پاش کر دے

ہو نہیں سکتے۔ جب تک کہ اور تمام آقاؤں سے انکار نہ کر دیں۔ زید سے اگر آپ کو محبّت ہے۔ تو اس کے یہ معنی ہیں۔ کہ اس کے تمام دشمنوں کے آپ دشمن ہو گئے۔ ایک چوکھٹ پر جب ہی سر جھک سکتا ہے۔ جب اور تمام جھکانے والی چوکھٹوں پر سے مغرورانہ گزر جائے۔ جب آپ نے کہا کہ میں روشنی ہی کو پسند کرتا ہوں۔ تو ضمناً اس کا بھی اقرار کر لیا۔ کہ تاریکی سے متنفر ہوں۔ آپ ایک ہی جانب اپنا مُنہ کر نہیں سکتے۔ جب تک اور ہر طرف سے منہ پھیر نہ لیں۔ اور ایک ہی سے اپنا رستہ جوڑ نہیں سکتے جب تک ہر طرف سے رشتے کاٹ نہ لیں۔ پس خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے لئے پہلی چیز یہ ہے کہ اس کے سوا اور جتنی قوتیں اپنی اطاعت کی طرف بلاتی ہیں۔ ان سب سے باغی ہو جائے اور اس کے آگے جھکنے سے پہلے اور تمام جھکانے والوں کے آگے مغرور ہو جائے۔ جو لوگ اس کی اطاعت کے مدعی ہیں اُن کو اطاعت سے پہلے سرکشی کا، وفاداری سے پہلے بغاوت کا، اور دوستی سے پہلے دشمنی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ ان کو آزمائش میں پڑ کر ثابت کرنا چاہیئے۔ کہ خدا کی وفاداری کے لئے انہوں نے کن کن قوتوں سے بغاوت کی ہے؟ اور اس کی محبّت کے پیچھے کس کس کو اپنا دشمن بنایا ہے۔ وہ حکومت الہٰی کے مقابلہ میں اپنا تخت تسلط بچھانے والی قوت شیطانی، جو انسانوں کو خدا سے چھین کر اپنا مطیع و منقاد بنانا چاہتی ہے اور جس کے مظاہر تمہارے اندر اور باہر دونوں جگہ موجود ہیں۔ مدعیان اطاعت الہٰی کے لئے دنیا میں اصلی اور پہلی آزمائش ہے۔ کوئی ہستی خدا کی مطیع ہو نہیں سکتی

الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

سلسلۂ سخن میں ہم بغیر کسی گریز کے مقصود اصلی تک پہنچ گئے۔ اس مقامِ اطاعتِ الٰہی ہی سے وہ اصل اصول اسلامی رونما ہوتا ہے، جس کو قرآن کریم نے الامر بالمعروف والنہی عن المنکر کے جامع و مانع الفاظ میں بیان فرمایا ہے اور جو اس دینِ قدیم کا اصل اساس اور امت مرحومہ کے شرف و فضائل کی علت حقیقی اور اس کے تمام اصول و فروع کے لئے بمنزلۂ عماد کار اور بنیاد شریعت بیضا کے ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنہون عن المنکر و تومنون باللہ (۳:۶)

تم تمام امتوں میں سب سے بہتر امت ہو اس لئے کہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو۔ اور برائی سے روکتے ہو۔ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

دوسری جگہ سورۂ حج میں فرمایا۔

الذین ان مکنا ھم فی الارض اقاموا الصلٰوۃ و اٰتو الزکوٰۃ و امروا بالمعروف و نھوا عن المنکر، و اللہ عاقبۃ الامور (۲۲ : ۴۳)

اگر ہم مسلمانوں کو حکومت اور خلافت دے کر دنیا میں قائم کر دیں تو ان کا کام ملک گیری یا عیش و عشرت نہ ہوگا۔ بلکہ یہ کہ اللہ کی عبادت کریں گے۔ دنیا کو نیک کاموں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے اور سب کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھوں میں ہے۔

دولت دنیا میں ہمیشہ سے شیطان کی سیر و سیاحت کا سب سے بڑا مرکز رہی ہے اور ضلالت کی تاریکی نے چاندی اور سونے کی دیواروں کے اندر ہمیشہ گھر بنایا ہے۔ پس ہر اس غرور اور ادعا کو جو دولت اور عزّ و جاہ دنیوی سے پیدا ہو شیطان کا بت یقین کرے۔ اور خدا کی عزّت کی خاطر جہاں تک ممکن ہو اسے ذلّت سے ٹھکرا دے۔ اور حکومتوں کا استبداد علماء سوء اور مذاہبی پیشواؤں کا استیلا، دنیوی رہنماؤں اور جماعتی حکمرانوں کا قہر و تسلّط، رسم و رواج اور سوسائٹی کے دباؤ کی بندش، یہ تمام چیزیں بھی شیطان ہی کے تخت کے سائے میں نشو و نما پانے والی ہیں۔ اور ان کی قوت بھی " ما انزل اللّٰہ بھا من سلطان " میں داخل، پس خدا کی محبّت کے لئے ان سب کا دشمن ہو جائے، اور اس کے نام کی عزّت کو بلند کرنے کے لئے ان سب کو ذلیل و رسوا کرے۔ اپنی زبان کو، اپنے دماغ کو، اور اپنی تمام قوتوں کو وقف کر دے۔ تاکہ جو اطاعت الٰہی سے سرکش انسان حق و صداقت کی عزّت کو دنیا میں تاراج کر رہی ہیں۔ ان کی عزّت باطلہ کے تاراج و غارت کرنے کا وہ ذریعہ بنے اس کی زبان حق کی زبان ہو اور قدم حق کے قدم ہوں۔ زبان سے ان کی تحقیر و تذلیل کرے۔ اور پاؤں سے ان کے مغرور سروں کو کچلے۔ جب اس منزل امتحان سے وہ گزر جائے گا۔ اس وقت اللّٰہ اور اس کے رسول کا مطیع ہو گا۔ کیوں کہ جو اللّٰہ کا مطیع ہو۔ ضرور ہے کہ شیطان سے باغی ہو۔

بادنیٰ تغیر موجود ہے۔ کس قدر واضح طور پر اس فرض کی تشریح فرما دی ہے۔

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم تستطع فبلسانہ فان لم تستطع فبقلبہ وذالک اضعف الایمان۔

تم میں سے جو مسلمان کوئی خلاف حق بات دیکھے تو اسے چاہیئے۔ کہ اپنے ہاتھ کے زور سے اس کو دور کرے۔ اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے اس کی برائی بیان کرے اگر اس کی بھی قدرت نہ دیکھے تو کم از کم دل ہی دل میں اس کو برا سمجھے مگر یہ آخری ایمان کا نہایت ضعیف درجہ ہے۔

اسلام کی تعلیم کا اصلی عملی دور دراصل وہی اس کا ابتدائی زمانہ تھا۔ جو افسوس ہے۔ کہ بہت جلد ختم ہو گیا۔ یہ اسی فرض اسلام کی قوت تھی۔ جس نے قرون اولیٰ میں تمام اسلامی سرزمین کو اعمال حسنہ کی حکومت سے نیکیوں کی ایک بہشت بنا دیا تھا۔ شیطان اس وقت بھی آتا تھا۔ جیسا کہ اب ہے اور اس کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ڈال دی گئیں تھیں۔ مگر یہ ضرور تھا کہ اسلام اور امر بالمعروف کے حکم سے کوئی باہر نہ تھا۔ ہر شخص یقین کرتا تھا۔ کہ وہ "مسلم" ہے، اس لئے دنیا میں خدا کا قائم مقام اور اس کا نائب ہے، پس دنیا کی ہر چیز اور ہر عمل کو اپنی آنکھ سے نہیں بلکہ خدا کی آنکھ سے دیکھتا تھا۔ اور اپنی خواہشوں پر مرضات اللہ کو مقدم رکھتا تھا۔ ہم اس زمانے کے حالات میں پڑھتے ہیں۔ کہ ایک عورت نفس کے تسلط سے مجبور ہو کر زنا کے ارتکاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور اس کی کسی تنفس کو خبر نہیں ہوتی۔ مگر وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

اس آیت میں اللہ تعالے نے مسلمانوں کے عروج اور وارث الارض ہونے کی اصلی علت یہ بیان کی ہے۔ کہ وہ دنیا میں اعمال حسنہ انجام دیں گے۔ اور پھر ان کی تشریح کی ہے۔ کہ وہ عبادت بدنی و مالی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ پس فی الحقیقت حق کا اعلان اور گمراہی کا روکنا ایک ایسا فرض اسلامی تھا۔ جس کو مثل نماز اور زکوٰۃ کے ہر مومن و مسلم پر فرض کر دیا گیا تھا۔ اور دنیا میں اس امت کو خدا کی طرف سے یہ خدمت تفویض کی گئی تھی۔ کہ حق کے قیام اور گمراہی کے انسداد کا اپنے وجود کو ذمہ دار سمجھے اور ہر چیز کو گوارا کرے مگر حق کی مظلومی کی ان کو برداشت نہ ہو۔

یہ فرض عام تھا کسی خاص جماعت کی اس میں خصوصیت نہ تھی۔ امم قدیمہ کی گمراہی کا ایک بڑا سبب یہ تھا۔ کہ یہ فرض ہمیشہ علماء رو سوائے دینی کے قبضہ اقتدار میں رہا اور اس لئے جس وقت تک وہ خود حق پر قائم رہے۔ قوم بھی ہدایت پر قائم رہی اور جب وہ گمراہ ہو گئے۔ تو قوم کی قوم بھی برباد ہو گئی۔ اسلام نے اس مرض کا یہ علاج تجویز کیا۔ کہ "امر بالمعروف" کو ہر فرد امت کا فرض قرار دیا۔ اور اس کی ذمہ داری پوری قوم پر پھیلا دی۔ یعنی ہر مومن جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا اقرار کرتا ہے۔ کہ وہ اپنی زندگی کو قیام حق اور انسداد باطل کا ذمہ دار سمجھے گا۔ اور اس کی تمام قوتیں صرف اس لئے ہوں گی۔ کہ نیکی کی نصرت کریں اور برائی کو روکیں۔

علاوہ ان آیات کریمہ کے (صحیح مسلم) کی ایک مشہور حدیث میں جس کو حضرت ابو سعید خدری نے روایت کیا ہے، اور نیز نسائی، ترمذی، اور ابن ماجہ میں بھی

اذلة على المؤمنين اعزة على الكافرين يجاهدون في سبيل الله ولا يخافون لومة لائم۔ (۵ : ۶۲)

ایمان اور صداقت کے سامنے نہایت عاجز نظر آتے ہیں مگر کفر و ضلالت کے سامنے نہایت مغرور۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور پھر کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے (کیونکہ وہ صرف اللہ سے ڈرنے والے ہیں)

اسی "امر بالمعروف" کے اصول کا نتیجہ وہ آزادی و راست گوئی اور بے باکانہ حق پژوہی تھی، جس کے بیشمار نظائر سے عہد اول کی تاریخ لبریز ہے۔ سرزمین اسلام کا ایک ایک بچہ اور مدینے کی گلیوں کی بوڑھی عورتیں اعلان حق کی جو قوت اپنے اندر باقی رکھتی تھیں وہ آج علم و دولت کی قوت کے مجسموں کو بھی نصیب نہیں "امر بالمعروف" کی روح نے ایک ایسی زندگی ہر مسلمان میں پیدا کر دی تھی کہ خلاف حق و صداقت عمل کو دیکھ کر بے اختیار تڑپ جاتا تھا۔ اور پھر نہ تلوار اس کی زبان کو بند کرنے پر قادر تھی اور نہ حکومت کا تخت سطوت اس کی آواز کو دبا سکتا تھا۔

بنی اُمیہ کا استبداد

"امر بالمعروف" کے سدّ باب کا پہلا دن

ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر قیامت کے دن دنیا کے ظالموں کی صفوف عام فساق و فجار سے الگ قرار دی جائیں گی۔ تو ان میں سب سے پہلی صف یقیناً (بنی امیہ) کی ہو گی، انہی ظالموں نے اسلام کی اس روح حریت کو غارت ظلم و استبداد کیا۔ اور اس کے عین عروج اور نشو و نما کے وقت اس کی قوت نمو کو اپنے اغراض مشخصہ کے

یں آتی ہے۔ اور اپنے زنا کا اقرار کر کے مجبور کرتی ہے کہ سنگسار کی جائے۔ اور پھر انقضائے حمل کے بعد پورے عزم و استقلال سے آکر سنگسار ہوتی ہے۔ ہم کو اُس زمانے میں وہ ہزاروں انسان نظر آتے ہیں۔ جو حق کے اعلان کی خاطر اپنے تمام عزیزوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اللہ کی راہ میں ان سخت سے سخت مظالم کو ہنسی خوشی برداشت کرتے ہیں جو باطل کے پرستاروں کے ہاتھوں ان کو جھیلنے پڑتے ہیں۔ باپ نے اپنے بیٹے کو خلاف چلتے دیکھ کر اپنے ہاتھوں سے سزائیں دی ہیں۔ اور بیٹوں نے اپنے والدین کے مقابلہ میں تلوار اٹھائی ہے۔ دنیا کے اختیار میں ہے کہ اس عہد سے اعلیٰ تمدن بہتر ساز و سامان معیشت اور ترقی یافتہ علوم و فنون پیش کر دے۔ لیکن یہ قطعی ہے کہ اس زمانہ سے بہتر وہ انسان نہیں دکھلا سکتی۔

یہی لوگ تھے جن کی تعریف میں خداتعالیٰ نے فرمایا تھا کہ :۔

اشداءُ علی الکفار رحماءُ بینھم (۴۸ : ۲۹) کفر و ضلالت کے مقابلہ میں نہایت سخت ہیں ، مگر آپس میں ایک مومن دوسرے مومن کے لئے نہایت رحم دل ہے۔

ان کی دوستیاں اللہ کے لئے تھیں اور دشمنیاں بھی اللہ ہی کے لئے انہوں نے اپنے نفس کی خواہشوں کو مٹا دیا تھا اور اس کی جگہ اللہ کی رضا جوئی کے ولولے کی انگیٹھی روشن کر لی تھی " الحب فی اللّٰہ والبغض فی اللّٰہ " ان کا محور اعمال تھا ، وہ ملتے تھے۔ تو حق کی خاطر اور کٹتے تھے۔ تو صداقت کے لئے پھر اس راہ میں نہ کسی کا خوف تھا اور نہ کوئی دنیوی طاقت ان کو مرعوب کر سکتی تھی۔ کیوں کہ انہوں نے اس مالک الملک سے صلح کر لی تھی ، جس سے کائنات عالم کی ہر شئے ڈرتی ہے ، پس اب ان کو کسی ڈرانے والے سے شکست کھانے کا خوف نہ تھا۔

استیلاء استبداد سے امر بالمعروف ،، کا نشوونما رک گیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اس کی قوت ضعیف سے ضعیف تر ہوتی جاتی تھی۔ لیکن تاہم اسلام نے قوم کے اندر اس اصل کی روح جس قوت کے ساتھ پھونک دی تھی۔ اس کی ہلاکت کے لئے ایک مدت مدید درکار تھی۔ باوجود عجمی حکومت مستبدہ کی تقلید، اور قہر و استیلائے شدید کے جو آل عباس کو حاصل تھا۔ (مامون الرشید) جیسے عظیم الشان اور (متوکل) جیسے ظالم کے دربار میں آپ کو صدہا اشخاص نظر آئیں گے۔ جن کو تخت بغداد کی عظمت و شوکت بھی مرعوب نہ کر سکی۔ اور اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر انھوں نے امر حق کا اعلان کیا (مامون الرشید) کا استبداد جب مسئلہ (خلق قرآن) میں ظلم و تشدد تک پہنچ گیا، تو دار الخلافت بغداد میں علمائے حق کی مظلومی نہایت دردانگیز تھی۔ لوگوں کو جبر و تشدد کے ساتھ مجبور کیا جاتا تھا۔ کہ حدوث قرآن کا اقرار کریں۔ اور جو انکار کرتے تھے، ان کو طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کیا جاتا تھا۔ جامع مسجد میں سوائے جہمیہ و معتزلہ کے کسی کو حق نہ تھا کہ وعظ و ارشاد کرے، اور جو شخص زبان سے قدم قرآن کا لفظ نکالتا تھا۔ اس کی سزا موت تھی لیکن بایں ہمہ ایسے جان بلب اور خونریز موقع پر شیخ (عبدالعزیز بن یحییٰ الکنانی) مکہ معظمہ سے چل کر بغداد تک صرف اس لئے آتا ہے۔ تاکہ دار الخلافہ کی جامع مسجد میں خلق قرآن کے ابطال پر علانیہ وعظ کہے۔ اور اس طرح گرفتار ہو کر مامون کی مجلس تک پہنچے، اور پھر اس کے سامنے " امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کے فرض کو انجام دے۔

چنانچہ وہ بغداد پہنچ کر عین جمعہ کے دن جامع (رصافہ) میں جاتا ہے اور بعد نماز کے ممبر پر سے پکار کر کہتا ہے۔ " کلام اللہ منزل غیر مخلوق "!!

لیئے کھل ڈالا۔ ان کا اقتدار و تسلط فی الحقیقت امر بالمعروف کے سدباب کا پہلا دن تھا۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے اسلام کی جمہوریت کو غارت کر کے اس کی جگہ شخصی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ جو یقیناً اعتقاد قرآنی کی رو سے کفر جلی ہے، بلکہ سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ اظہار حق اور امر بالمعروف کی قوت کو تلوار کے زور سے دبا دینا چاہا اور مسلمانوں کی حق گوئی کے تمام ولولے کو مضمحل کر دیا۔ تاہم چونکہ عہد نبوت کا فیضان روحانی اور تعلیم قرآنی کا اثر ابھی بالکل تازہ تھا۔ اس لیئے اگرچہ طرح طرح کی بدعات اور منکرات و معاصی کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی امر بالمعروف ''کی آواز کی گرج کو فردمشق کے ایوان و محل نہ ہلا دیتی تھی، ساٹھ برس کی ایک بڑھیا عورت بر سر دربار بلائی جاتی تھی۔ اور (معاویہ) کے سامنے بے دھڑک اپنے وہ اشعار جوش و خروش کے ساتھ پڑھتی تھی۔ جن میں نہ صرف حضرت امیر علیہ السلام کے مناقب ہوتے تھے۔ بلکہ کھلے کھلے لفظوں میں بنی امیہ کے فضائح و مثالب بیان کیئے گئے تھے۔ عبدالملک جیسا بارعب و جبروت شہنشاہ مدینے آتا تھا تو اس کے دروازے سے گلیم پوش فقرا دھکیل نکلتے تھے اور بر سر دربار اس کو ظالم بتلاتے تھے۔ تاریخ میں ہم صدہا واقعات کے ضمن میں پڑھتے ہیں کہ (حجاج) کے سامنے اس کی بے نیام تلوار رکھی رہتی تھی، لیکن جان فروش مومن آتے تھے اور اس کی تلوار کو حقارت سے دیکھ کر اپنی نشتر حق گوئی سے خود اس کے دل کو مجروح کر دیتے تھے۔

عہد عباسیہ اور علمائے حق کی استقامت

بنو امیہ کے بعد ان کی ہر چیز کے وارث عباسی ہوئے اور گو حکومت کے

عزوجاہ کی لعنت میں گرفتار ہو کر شیطان کا سب سے بڑا مرکب فساد بن جاتا ہے۔ اور دین و علم کو مذہب و رؤساء کی ابلیسانہ خواہشوں کے تابع کر دیتا ہے، اس کا علم و مذہب اور وعظ و ارشاد حق کے لئے نہیں۔ بلکہ دنیا کے لئے ہوتا ہے۔ وہ قوم کو حق کی طرف نہیں بلاتا بلکہ خود قوم کی ضلالت اور گمراہی کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بن کر رہتا ہے۔ جس عقیدے اور تعلیم کو جلب قلوب اور امراء و رؤساء کی خوشنودی کا ذریعہ دیکھتا ہے، بیان کرتا ہے اور جس کو ان کی خواہشوں کا مخالف پاتا ہے ترک کر دیتا ہے۔ قرآن کریم نے علمائے یہود کی سب سے بڑی مذمت یہی بیان کی تھی۔

فخلف من بعدهم خلف ورثوا الكتاب يأخذون عرض هذا الأدنى ويقولون سيغفر لنا، وإن يأتهم عرض مثله يأخذوه ألم يؤخذ عليهم ميثاق الكتاب ان لا يقولوا على الله الا الحق ودرسوا ما فيه والدار الآخرة للذين يتقون افلا تعقلون

پھر بنی اسرائیل میں سلف صالح کے جانشین اور کتاب تورات کے وارث ایسے ناخلف ہوئے۔ جو احکام الٰہی کو اغراض دنیوی کے لئے تبدیل کر دیتے ہیں۔ اور حق کو چھپاتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے صلے میں دنیائے دوں کا کوئی ذلیل حصہ مل جاتا ہے۔ اور اس پر طرہ یہ ہے۔ کہ باوجود اس کے کہتے ہیں کہ (ہم علماء میں سے ہیں) اس لئے ہمارا گناہ تو معاف ہو جائے گا اور اگر پہلی چیز کی طرح کوئی اور دنیاوی چیز ان کے سامنے آجائے تو پھر اسکے لینے کے لئے بھی

اس کی ہلاکت طلب جرأت سے تمام مسجد میں ہنگامہ بپا ہوگیا۔ اور لوگوں نے کہا کہ یہ زندگی سے بیزار یا مجنوں وا البعقل ہے۔ بالآخر (عمرو بن مسعدہ) رئیس الشرطہ (کوتوال شہر) کو فوراً اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ اس نے آکر (عبدالعزیز کو گرفتار کر لیا۔ اور اس کی خواہش کے بموجب دربار خلافت تک پہنچا دیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے مجلس مناظرہ اور حضور خلیفہ کی درخواست کی اور مامون رشید کی موجودگی میں اس عقیدے کے فسادات کو ایک ایک کر کے بیان کیا۔ (ومن شاء التفصیل فلیرجع الی الرسالۃ لہ انفہا فی حدیث لہٗ فی بغداد)

ظہر الفساد فی البر والبحر

عباسیہ کے بعد فتنۂ تاتار کی غارت گری نے تاریخ اسلام کا ورق الٹ دیا۔ اور ایک وحشی قوم اسلام کے عرشِ حکومت کی مالک ہوگئی۔ عربی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی دعوتِ اسلامی کی بقیہ قواعد کا بھی خاتمہ ہوگیا تھا۔ اور فتنہ وفساد جنگ و جدال، حکومتوں اور قوموں کے تصادم اور دائمی کشت وخون ریزی سے نفسانی اغراض ظلم و عدوان کی فضا ہر طرف پھیل گئی تھی۔ سب سے بڑا فتنہ علمائے سو کی کثرت اور علمائے حق کی غربت تھی۔ خلافت راشدہ کے اختتام کے ساتھ ہی شخصی حکومت کی بنیاد پڑ گئی تھی اور شخصی حکومت کی سب سے زیادہ قاتل سمیت علماء و روساکی علامت اور مصاحبت کی رسم کا پیدا ہونا ہے۔ جو دنیوی عز و جاہ کے حصول کا ذریعہ اور بادشاہ وقت کے تقرب وطلب توجہ کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ اور یہ سب سے بڑی دین و علم کی آزمائش ہوتی ہے جو بوجھل زنجیر بن کر طبقہ علماء کے پاؤں میں پڑ جاتی ہے۔ پھر یہ طبقہ زرپرستی اور حصول

کردیتا ہے۔ اور اس کی جگہ دولت و امارت اور جماعت و عوام کی حکومت قائم کرا دیتا ہے۔ وہ حق کو دیکھتے ہیں کہ مظلوم ہے لیکن زبان نہیں کھولتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حق کی نصرت ان کے اغراض نفسانیہ کے لئے مضر ہے جو دل خدا سے نہیں ڈرتا۔ پھر وہ دنیا کی ہر شے سے ڈرنے لگتا ہے۔ پس وہ اللہ کی حکومت سے آزاد ہو کے شیطان کے ہر ادنٰے سے ادنٰے مظہر اور ذریت کے غلام ہو جاتے ہیں اور چونکہ اُمراء و رؤسا یا عوام و جہلا سے جلب نفع اور حصول زر کی خواہش اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی قدرت سے باہر ہوتا ہے کہ ان کے خلاف لبوں کو حرکت دے سکیں وہ حق اور راستی کو پہچانتے ہیں۔ لیکن اس کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ نہیں کر سکتے کیونکہ ڈرتے ہیں۔ کہ پھر دولت و جاہ دنیوی کے بُت اپنا ہاتھ ان کے سروں پر سے ہٹا لیں گے۔ وان فریقا منھم لیکتمون الحق وھم یعلمون ٥ (٢:١٤٢)

فی الحقیقت تاریخ اسلام کی گذشتہ آخری صدیاں "الامر بالمعروف" کی تاریخ کا ایک عہد تاریک تھا۔ جس میں روز بروز پچھلی روشنی مفقود ہوتی گئی۔ اور نئی تاریکی اس کی جگہ قبضہ کرتی گئی۔ اجتماعی فسادات و امراض کے علاوہ سدّ باب اجتہاد اور اعتقاد تقلید نے تمام علوم عقلیہ و دینیہ کی ترقی روک دی تھی۔ اور علی الخصوص علوم دینیہ کی درس و تدریس میں وہ تمام نقائص جن کو علامہ (ابن خلدون) نے اپنے زمانے میں محسوس کیا تھا۔ پیدا ہو چکے تھے۔ جو بالآخر بڑھتے بڑھتے آج اس حد تک پہنچ گئے ہیں۔ کہ علوم قدیمہ کی تفصیل صرف متاخرین کی چند کتابوں اور حواشی و شروح کے پیچھے صرف دماغ

(۱۶۸ : ۷) | تیار رہتے ہیں کیا ان گمراہوں سے وہ عہد جو توراۃ میں مرقوم ہے نہیں لیا گیا ہے۔ کہ" ہم

حق بات کے سوا دوسری بات خدا کی طرف منسوب نہیں کریں گے" پھر جو کچھ توراۃ میں ہے وہ اسے پڑھ چکے ہیں۔ اور کچھ جاہل ویسے جو کچھ نہیں ہیں۔

زوال بغداد کے ساتھ ہی عربی قوت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ اور ترکوں کا جو اقتدار ایک صدی سے نشوونما پا رہا تھا۔ وہ تمام عالم اسلامی پر چھا گیا۔ ترک ایک نو مسلم قوم تھی۔ جو عربی زبان سے واقف نہ تھی اور نہ اس کو دین و مذہب کی کچھ خبر تھی۔ اس لئے مجبوراً اس کو تمام علمی و مذہبی معاملات میں علماء سے مدد لینی پڑی۔ اور اس طرح علم و مذہب پیشتر سے زیادہ حصول قوت و حکمرانی اور دولت و جاہ دنیوی کا ذریعہ بن گیا۔ یہ "امر بالمعروف" کی بقیہ زندگی کے لئے گویا ایک آخری فتوی موت تھا۔ کیوں کہ اب علم و مذہب اعلان حق و دفع باطل کے لئے نہیں بلکہ حصول عزت و جاہ اور حکومت و تسلط کے لئے حاصل کیا جانے لگا۔ اور نفس پرست بادشاہوں اور امیروں کے دربار کی پہلی صفوں میں علماء و فقہا کی قطاریں نظر آنے لگیں۔ علم حق ایک نور الہٰی ہے۔ جو اغراض نفسانیہ کی تاریکی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔ وہ حق و صداقت سے مگر کذب و باطل کی پرستش کرتا ہے۔ پس جن دلوں میں دنیوی لذائذ اور حکومت و امارت کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ علم و حقانیت کو ان نفوس خبیثہ کا تابع و محکوم کر دیں۔ جن کے ہاتھ میں دولت و عزت و جاہ دنیوی کی بخشش کی قوت ہے۔ غرض اور ہوس کا تسلط ان کے دلوں سے خدا کی حکومت کے خوف کو زائل

کے بقاو احیاء اور دعوت الی الحق والہدایۃ کے لئے روزِ اوّل سے خدا تعالےٰ کے کار و بار نصرت فرمائی عجیب و غریب رہے ہیں ۔ امم قدیمہ کے حالات ہم پڑھتے ہیں ۔ تو کوئی ہدایت اور دعوت صداقت ایسی نہیں ملتی جو اپنے داعی ربانی مذہب کی زندگی کے بعد ایک صدی تک بھی دنیا میں قائم رہ سکی ہو۔ ان اقوام کی تاریخ سے قطع نظر کرنی پڑتی ہے۔ جو اپنی گزشتہ تاریخ کے لئے کوئی بصیرت بخش روشنی نہیں رکھتے ۔ لیکن دنیا کی جو بڑی قومیں اور مذاہب آج موجود ہیں ۔ ان کی قرون اولےٰ کی تاریخ ہمارے سامنے ہے ۔ حضرت موسیٰ چالیس دن کے لئے وادی سینا کے پہاڑوں پر چلے گئے تھے ۔ تاکہ وحی الٰہی سے توریت مقدس کو مرتب کریں ۔ لیکن اتنے ہی دنوں کی غیبت میں تمام قوم کی قوم گوسالہ پرست ہوگئی تھی اور ان کی برسوں کی تعلیم و ہدایت پر ایک شعبدہ باز کے چند لمحوں کا کرشمہ غالب آگیا تھا ۔

فرجع موسیٰ الی قومہ غضبان اسفا ۔ قال یا قوم الم یعدکم ربکم وعدًا حسنًا افطال علیکم العہدُ ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم فاخلفتم موعدی (۲۰ : ۸۸)	حضرت موسیٰ غصّے اور تاسف کی حالت میں اپنی قوم کی طرف واپس آئے اور کہا کہ اے لوگو کیا تم سے خدا تعالےٰ نے توراۃ کے دینے کا وعدہ نہیں کیا تھا ؟ کیا تم کو اس وعدے کی مدت بہت بڑی معلوم ہوئی ۔ کہ بت پرستی میں مبتلا ہوگئے ؟ یا پھر تم نے یہ چاہا کہ تم پر تمہارے پروردگار کا غضب نازل

نوٹ اس موقعہ پر ہمیں (نہج البلاغۃ) کا ایک نہایت بلیغ قول یاد آگیا ۔ اور اس کا کون سا بیان

کر دینے میں محدود ہو گئی ہے۔ اور علوم قرآن وحدیث کہ سرچشمۂ ارشاد و ہدایت اور منبع امر بالمعروف ونہی عن المنکر تھے۔ محض (تفسیر جلالین) اور (مشکوٰۃ) کے الفاظ سے مناسبت پیدا کر لینے کا نام رہ گیا ہے۔

اگرچہ یہ گزشتہ آٹھ صدیوں کا زمانہ اسلام کے اخلاقی واجتماعی تنزل کا آخری دور تھا۔ اور جن امراض کی ابتدا بنی اُمیہ وعباسیہ کے زمانے میں ہوئی تھی وہ اب ہڈیوں سے گزر کر کے ظاہر جسم پر بھی نمودار ہو گئے تھے۔ لیکن تاہم خدا کی سرزمین حق وصداقت کی آواز سے کبھی بھی خالی نہیں رہی ہے۔ اور اس دین قدیم کی نصرت وتجدید کے لئے اس کا وعدہ ہے کہ وہ سخت سے سخت عہد طغیان وفساد میں بھی ایک جماعت صالحین امت کی ہمیشہ ایسی قائم رکھے گا۔ جن کے قلوب خود اس کی حفاظت اور پناہ میں ہوں گے۔ اور ضلالت شیطانی کو ان پر کبھی دسترس حاصل نہ ہو گا۔

ان عبادی لیس لک علیھم سلطان، وکفی بربک وکیلا (١٧ : ٢٧)

جو میرے سچے بندے ہیں ان پر شیطان کا قابو نہ چل سکے گا۔ اور اللہ اپنے بندوں کی کارسازی کے لئے بس کرتا ہے۔

فضیلت مخصوصۂ امت مرحومہ اور سلسلۂ دعوت حق کا قیام دائمی

اگر گوش حق نیوش باز، اور دیدۂ اعتبار بینا ہو تو فی الحقیقت اس دین قدیم

أجعل لنا الها كما لهم آلهة فقال انكم قوم تجهلون "

(نہج البلاغۃ جلد دوم ۔) صفحہ ۲۲ مطبوعہ مصر)

تو ابھی دریائے قلزم کی تری تمہارے پاؤں میں خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ تم نے باطل پرستی شروع کر دی ۔ اور ان سے فرمائش کی کہ ہمارے لئے بھی ویسا ہی بت بنا دے جس طرح کے بت ان بت پرستوں کے پاس ہیں " ۱۲ منہ

حضرت مسیح علیہ السلام کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے ۔ بلکہ محض شریعت موسوی کے ایک مصلح اور آخری مجدد تھے ۔ تاہم ان کی دعوت کی تاریخ چند برسوں سے آگے نہیں بڑھتی ۔ اور ہمیں خوف ہے کہ چند نادان اور ابلہ ماہی گیران کے ساتھ جمع ہو گئے تھے ۔ ان میں سوائے (یوحنا) کے کسی نے ان کی تعلیم کو سمجھا بھی تھا یا نہیں ؟ ان کے بعد چند برسوں کا زمانہ یہودیوں کے مظالم اور حواریوں کے تحمل و توکل کا ضرور سامنے آتا ہے ۔ جس میں ایک مظلومانہ اخلاق کی کشش یقیناً پائی جاتی ہے ۔ لیکن اس کے بعد ہی ایک متفنّی اور فیلسوف یہودی (سینٹ پال) کی شرکت سے مسیحی تحریک کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔ اور اس کی جگہ ایک نیا مذہب لے لیتا ہے ۔ جو رومی بت پرستی افلاطونی الہیات اور یہودیت کے چند مسخ شدہ رسوم کا مجموعہ تھا ۔

فاختلف الاحزاب من بينهم ، فويل للذين كفروا من مشهد يوم عظيم

پھر عیسائیوں میں بہت سے فرقے پیدا ہو گئے اور آپس کے اختلافات میں پڑ گئے ، پس افسوس ہے ان کی کفر و ضلالت پر اور ان کو

ہو اس لئے تم نے اس عہد ہدایت کو توڑ ڈالا
جو تم نے مجھ سے کیا تھا؟

اعلیٰ ترین بلاغت اور بہترین حکمت سے خالی ہے؟ بعض احبار یہود نے ان
اختلافات و نزاعات کو دیکھ کر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ میں
پیدا ہو گئے تھے حضرت امیر علیہ السلام سے کہا کہ اعتراضاً کہا کہ۔ ما دفنتم نبیّکم
حتی اختلفتم فیہ (ابھی تم لوگ اپنی نبی کو دفن بھی نہیں کر چکے تھے کہ اس کی نسبت
اختلاف میں پڑ گئے) اس اعتراض سے مقصود یہ تھا کہ قرآن کریم ہر جگہ یہودیوں کو ان
کے اختلاف اور تحریف و تبدیل شریعت کا الزام دیتا ہے۔ حالانکہ خود پیروان قرآن کا یہ
حال ہے کہ آنحضرت کی وفات کے ساتھ ہی اختلافات و نزاعات میں پڑ گئے لیکن حضرت
امیر علیہ السلام نے کس قدر بلیغ و جامع اور پھر قاطع و فیصل کن جواب عطا فرمایا کہ۔ : انما
اختلفنا عنه ۔ لا فیه (یہ سچ ہے کہ ہم میں اختلافات پیدا ہوئے لیکن اپنے نبی
کی نسبت نہیں بلکہ ان چیزوں کی نسبت جو اس سے تعلق رکھتی ہیں) یعنی ہم میں اختلاف
امم گزشتہ کی طرح خود داعی مذہب کے وجود اس کے درجۂ رسالت، اس کی نبوت،
اور نبوت کی صداقت کی نسبت نہیں پیدا ہوا۔ جس کی صحت و بقا پر دعوت دیانت
و حفاظت موقوف ہے۔ بلکہ ان چیزوں کی نسبت ہوا۔ جو اس سے منسوب تھیں، یا
پھر ان روایات کی نسبت ہوا جو اس کی نسبت سے بیان کی جاتی تھیں پھر آگے
حال کر فرمایا۔

ولکنکم ما جفت ارجلکم
من البحر حتی قلتم لنبیکم

حضرت موسیٰ نے جب تم کو فراعنہ مصر کی
غلامی سے نجات دلا کر ان کے ملک سے نکالا

پر (بخت نصر) کے تسلط کی تباہی سے کسی طرح کم نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اسلام کی
تباہی سے کسی طرح کم نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اسلام کی دعوت کا بیج اپنے اندر ایک ایسی قوت نمو رکھتا تھا کہ پامال ہوتا تھا۔ اور پھر ابھرتا تھا۔ حوادث و مصائب کے ہاتھ جس قدر اس کی شاخوں اور پتوں کو کاٹتے تھے۔ اتنی ہی اس کے قوت نمو ابلتے ہوئے چشمے کی طرح اچھل اچھل کر بلند ہوتی تھی۔ فتنہ و فساد کی باد صرصر اگر ان کی شاخوں کو ہلا رہی تھی۔ تو اللہ کا دست محکم اس کی جڑ کو مضبوط پکڑے ہوئے تھا۔ زمین کے اوپر اس کے پتے جھڑ جھڑ کر گر رہے تھے۔ یہ سچ ہے کہ امم قدیمہ کی تمام تباہیاں اور گمراہیاں ایک ایک کر کے اس امت کو بھی پیش آئیں کوئی گمراہی بنی اسرائیل اور مشرکین مکہ کی ایسی نہ تھی۔ جس سے اس شبہ گمراہیوں میں مسلمان مبتلا نہ ہوئے ہوں۔ مگر دین آخری کے بقا اور قیام کا یہ معجزہ تھا۔ کہ ان میں سے کوئی ضلالت بھی اصل سرچشمہ تعلیم کو مکدر نہ کر سکی۔ اور تحریف و نسخ اور حذف و اضافہ سے قرآن کریم ہمیشہ محفوظ رہا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ نصرت فرمائے حق کی تائید غیبی ہر سخت سے سخت دور فتن و طغیان میں ایک جماعت ایسی پیدا کرتی رہی جس کے قدم حق و حقیقت پر غیر متزلزل ہوتے تھے۔ اور چاروں طرف کی پھیلی ہوئی ضلالت سے محفوظ رہ کر باوجود قلت انصار و اعوان و عدم ساز و سامان دنیوی کے وہ جہاد امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں کامیاب و فتح یاب ہوتی تھی۔ اور حق تعالے اس کے دل و دماغ کو اپنے دست قاہر و مقتدر میں لے کر اپنے دین قدیم کی حفاظت اور ہدایت امت مرحومہ کا ذریعہ بنا دیتا تھا۔ دنیا میں صداقت ہمیشہ رہی، اور مختلف ناموں سے ہمیشہ آتی رہی لیکن

(۱۹: ۳۷) | ایک ایسے دن میں اللہ کے آگے حاضر ہونا پڑیگا

یہی حال تمام امم قدیم کا ہے۔ لیکن محمدی آیات صداقت اور اسلام حقانیت کے جن کے ذریعہ خدا تعالےٰ نے اس دین قدیم کی نصرت فرمائی ہے ایک بہت بڑی الہٰی نشانی یہ تھی کہ اس کی دعوت و تبلیغ کی حفاظت کا وعدہ فرمایا اور روز اول ہی کہہ دیا کہ :-

یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون
(۶۱: ۸)

پیروان باطل چاہتے ہیں کہ حق و صداقت کا جو نور الہٰی روشن کیا گیا ہے۔ اسے اپنی مخالفت کی پھونک مار کر بجھا دیں۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ اللہ اپنے اس نور صداقت کی روشنی کو درجۂ کمال تک پہنچا کر چھوڑے گا۔ اگرچہ باطل پرستوں کو برا لگے۔

دوسری جگہ فرمایا :-

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون
(۱۵: ۹)

بیشک ہم نے ہی اس دین حق و صداقت کی دعوت دنیا میں بھیجی اور ہم ہی ہیں جو ہمیشہ اس کے محافظ اور ناصر ہوں گے۔

اسی تائید الہٰی کا نتیجہ تھا کہ آنحضرت (صلعم) کی وفات کے دن ہی سے اختلافات کی بنیاد پڑ گئی اور پھر شخصی حکومتوں کے قیام، ملکی اغراض اور سیاسی مطامع کے نشار، عجمی اقوام اور عجمی تمدن و رسوم کے اتباع، اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر [illegible] یہاں تک کہ زوال بغداد اور

لعدوهم لا يضرهم من خالفهم" "بھی آخر میں زیادہ ہے۔ یعنی وہ جماعت حق دشمنان صداقت کے لئے اپنے اندر ایک الٰہی قہر و غضب رکھے گی۔ اور جو لوگ اس کی مخالفت کریں گے۔ وہ اسے نقصان پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔

اسی طرح ایک دوسری مشہور حدیث میں جس کو ابو داؤد حاکم و بیہقی نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔ ہم کو خبر دی گئی ہے۔ کہ اس دین الٰہی کے احیاء و تجدید کے لئے ہمیشہ خدا تعالیٰ مصلحان امت اور مجددان ملت کو بھیجتا رہے گا۔ اور وہ ہر صدی میں ظاہر ہو کر بدعات و محدثات کا استیصال کریں گے

ان اللہ تعالیٰ یبعث لهذه الامة علی راس کل مائة سنة من یجدد لها دینها	اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر صدی کے آغاز میں ایک مجدد پیدا کرے گا۔ جو دین اسلام میں اپنی روح ہدایت سے ایک تازگی اور نئی زندگی پیدا کر دے گا۔

کیا نہیں دیکھتے کہ یہی نصرت الٰہی اور آیت غیبی تھی جس نے باوجود ہیجان طغیان، واشتداد فساد، شیوع فتن، و اختلال کار و بار ہدایت ہر زمانے میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی آواز کو حی و قائم رکھا اور فساد و ضلالت کی کوئی سخت سے سخت قوت ابلیسی بھی اس قوت الٰہیہ پر غالب نہ آسکی۔ علی الخصوص تاریخ اسلام کی وہ گذشتہ آخری صدیاں جب کہ اسلام کے قدیمی مرکزوں کے اختلال، عربی حکومت کے خاتمے امرا و سلاطین کے طامعانہ و عیش پرستانہ اغراض، علمائے حق کی غربت و قلت اور قتل خونریزی

دین اسلام اس کا آخری ظہور تھا۔ اس لئے ضرور تھا کہ وہ کامل ترظہور ہو اور پھر اس طرح محکم اور ناممکن التبدیل ہو، کہ دنیا کی شیطانی قوتیں اس پر کبھی بھی غلبہ نہ پاسکیں۔

پس یہ ایک حقیقت تھی۔ جس کا اعلان پہلے ہی دن کہہ دیا گیا تھا۔ قرآن کریم کے علاوہ حدیث کا تفحص کیجئے۔ تو اس حقیقت کو جابجا ایک پیشین گوئی کی صورت میں پائے گا۔

لاتزال من امتی ظاہرین علی الحق حتی یاتیہم امر اللہ وہم ظاہرون (متفق علیہ)	میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت حق ضلالت و باطل پرستی پر فتح یاب رہے گی۔ یہاں تک کہ قیامت ظاہر ہو۔

اس حدیث کو امام بخاری و مسلم نے صحیح میں مغیرہ کی روایت سے درج کیا ہے۔ مگر یہی حدیث بہ تغیر الفاظ نہایت کثرت سے مختلف اسناد و رودات کے ساتھ شہرت پا چکی ہے اور متعدد صحابہ کرام سے مروی ہے۔ مسلم، ترمذی، اور ابن ماجہ میں بروایت ثوبان ہے۔

لاتزال طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق لایضرہم من خذلہم۔ حتی یاتی امر اللہ وہم کذلک	ہمیشہ میری امت میں ایک جماعت رہے گی جو حق و صداقت کے اعلان میں فتح یاب ہوگی، باطل پرست اس کی مخالفت کریں گے۔ مگر ان کی ضرر رسانی سے خدا اس کو محفوظ رکھے گا۔

ابن ماجہ اور نسائی کی بعض روایتوں میں قتال و جہاد کا بھی لفظ ہے۔ اور مسلم کی ایک حدیث میں جو کہ عقبہ بن عامر نے روایت کیا ہے۔ فاھرین

کے خاندان کے دخل سے حالت ضرور بدلی۔ مگر یہ تبدیلی بھی کچھ زیادہ مفید نہ تھی۔ کیوں کہ وہ خود پچھلے مرض کا ایک بے اعتدالانہ علاج بالمثل تھا۔ لیکن عین اُسی زمانے میں حضرت (شیخ احمد سرہندی) کا ظہور ہوتا ہے، جو ایک غیر معروف گوشے میں بیٹھ کر لاکھوں دلوں کو اپنی صدائے رعد آسائے حق کا شیفتہ بنا لیتے ہیں۔ اور احیائے شریعت وتجدید شعار اسلامی اور اعلان حق وامر بالمعروف کے لئے اپنے وجود کو یکسر وقف کر دیتے ہیں۔ پھر گیارہویں صدی کے اواخر اور بارہویں کے آغاز میں حضرت شاہ (ولی اللہ) اور ان کے خاندان نے امر بالمعروف کی تاریخ میں جو حیرت انگیز خدمات دینیہ انجام دی ہیں محتاج بیان نہیں، علی الخصوص (شاہ ولی اللہ) کا وجود قدسی، جو فی الحقیقت اپنے اندر الہام ربانی وفیضان الٰہی اور فطرت کاملہ واقتباس انوار نبوت کی ایک مستثنیٰ مثال رکھتا تھا اسی طرح گیارہویں صدی کے آواخر میں قاضی (شوکانی) کا یمن میں ظہور، اور احیاء سنت اور رفع بدعت کے لئے سعی مشکور، احادیث مذکورہ کی پیش گوئی کے لئے ایک مثال صداقت ہے۔

اگر یہ تائید غیبی اور کاروبار الٰہی نہیں ہیں۔ تو پھر یہ کیا بات ہے کہ ہر زمانے میں کچھ لوگ ایسے نظر آتے ہیں۔ جو اپنے زمانے کی سوسائٹی میں پرورش پاتے ہیں۔ اور بچپن سے لے کر عہد شعور تک انہی خیالات و استفادات اور رسم ورواج کو دیکھتے اور سنتے ہیں۔ جن کی فضا ان کے چاروں طرف محیط ہوتی ہے۔ کانوں میں ان کی صدا آتی ہے تو باطل پرستی کی، اور آنکھیں دیکھتی ہیں تو ضلالت وفساد کو لیکن پھر ایک غیبی ہاتھ ہوتا ہے جو ان کا بازو

کی شدت و احاطہ سے تمام عالم اسلام کی حالت موجودہ تنزل و انحطاط کے اسباب فراہم کر رہی تھی اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے۔ تو پھر بھی اس کے ہر دور میں چند نفوس قدسیہ ایسے ضرور مل جاتے ہیں۔ جن کے سینوں کو خدا نے نور ہدایت کے لیے کھول دیا تھا۔ اور ان کے دلوں کو حق صداقت کے جمال کا مسکن بنا رکھا تھا۔ آٹھویں صدی ہجری میں جب کہ مسلمانوں میں علم و دین کے تنزل و انحطاط کا بیج بار آور ہو چکا تھا۔ علامہ (ابن تیمیہ) کا پیدا ہونا اور ان کا علاوہ علوم و فنون میں درجہ رسوخ و اجتہاد پیدا کرنے کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی راہ میں ہر طرح کے شدائد و مصائب کا گوارا کرنا اور اپنے تلامذہ و متبعین کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا کر دینا۔ جس میں علامہ (ابن قیمؒ) جیسے اشخاص کا پیدا ہونا کس قدر تعجب انگیز ہے؟

لیکن اس تعجب انگیز ظہور کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جن کو مسلمانوں کے اس ذہنی اور قلبی انحطاط کا صحیح اندازہ ہے جو چھٹی صدی کے بعد تمام عالم اسلامی پر طاری ہو گیا تھا۔ اور سد باب اجتہاد نے اذہان و عقول کی ترقی کو اس کے عین عروج و ارتقاء کے وقت ہلاک کر دیا تھا۔

اگر صرف ہندوستان ہی میں دعوت حق کی تاریخ پر نظر رکھی جائے تو یہ آپ کے لئے ایک قریب کی مثال ہو گی۔ تاریخ ہند میں (اکبر) کا عہد اس لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ سلاطین پرست اور متبعین ہوائے نفس علماء کے دربار پر حکومت تھی۔ اور دینداری اور تقدس کے پردے میں نفسانی تعصبات اور مفسدانہ اغراض کام کر رہے تھے۔ آخر میں (ملا مبارک)

ان اللہ فالق الحب والنوی یخرج الحی من المیت ومخرج المیت من الحی ذالکم اللہ فانی یوفکون؟ (۶۰)

بیشک خدا ہی ہے جو زمین کے اندر بیج اور دانے کو پھاڑ کر اس سے ایک درخت قوی و بلند پیدا کر دیتا ہے۔ وہی زندے کو مردے سے نکالتا ہے۔ اور مردے کو زندے سے پیدا کرتا ہے۔ یہی عجائبات قدرت کے کرشمے دکھانے والی ذات تمہاری مالک ہے۔ پھر تم کدھر بہکے جاتے ہو۔؟

درحقیقت یہ ملکۂ ہدایت اور فطرت صحیحہ کے (روحانی ارتقاء) کا ایک سلسلہ ہے جس کا آخری درجہ مقام نبوت ہے۔ مگر اس کی ابتدا اصلحائے امت کے مرتبے سے ہوتی ہے وہ تمام نفوس قدسیہ جن کو خدا تعالے ہدایت وارشاد عالم کے لئے چن لیتا ہے، اگرچہ نبی نہیں ہوتے۔ مگر اس زنجیر کی ایک کڑی ہوتے ہیں جس کی آخری کڑی مرتبہ نبوت ورسالت ہے۔ اللہ تعالے ان کے دلوں کو فیضان نبوت سے مستفید ہونے کے لئے کھول دیتا ہے اور جس طرح آفتاب کی روشنی تمام ستاروں کے اجسام کو روشن ومنور کر دیتی ہے۔ بالکل سی طرح ان کے قلوب آفتاب نبوت کی ضیابخشی سے انوار اندوز ہو کر چمک اٹھتے ہیں۔ اسی ارتقائے انسانیت کے وہ چار مراتب ہیں۔ جن کو قرآن کریم نے بالترتیب اس آیت میں گنایا ہے۔ اور ان کو خدا تعالے کی تمام نعمتوں اور برکتوں کو مورد ومہبط قرار دیا ہے کہ :۔

الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء و الصالحین وحسن اولئک رفیقا۔

تھام کر شاہ راہ عام سے الگ ایک راہ پڑ جاتا ہے۔ اور فیضان ہدایت الہٰی کی ایک مخفی قوت ہوتی ہے۔ جس کا سرچشمہ ان کے سینے کے اندر سے اُبلنے لگتا ہے۔ وہ جب زبان کھولتے ہیں تو ان کی آواز ان کے زمانے کے عام اعتقادات و خیالات سے بالکل متضاد ہوتی ہے اور اپنے خاندان سوسائٹی تعلیم و تربیت اور ملکی رسم و رواج سے بالکل الگ ہو کر حق و صداقت کی طرف دنیا کو دعوت دیتی ہے۔ انسان اپنے تمام خیالات و معتقدات میں خارجی اثرات کا تابع ہے۔ وہ دنیا میں آتا ہے اور ایک خاص طرح کی تربیت و سوسائٹی میں نشوونما پاتا ہے۔ یہی تربیت اس کے تمام خیالات و معتقدات کی جڑ بن جاتی ہے اور وہ جو کچھ سمجھتا اور جانتا ہے۔ یکسر اس کے گرد و پیش کے اثرات کا عکس ہوتا ہے۔ پس وہ کون سی چیز ہے جو ایک شخص پر ان تمام اثرات کے خلاف جو اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے رہتے ہیں۔ بالکل ایک نئے خیال اور عقیدے کی راہ کھول دیتی ہے، اور وہ باوجود تمام ملک اور زمانے کو اپنا مخالف دیکھنے کے تن تنہا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ کہ رسم و رواج معتقدات عام، دولت و ثروت اور حکومت و سلطنت کے مقابلے میں حق کی تائید و نصرت کے لئے جہاد کرے۔

یہ کیا نیرنگی ہے کہ آذر بُت تراش کے گھر میں خلیل بُت شکن پیدا ہوتا ہے اور پرستاران لات و منات کی سرزمین سے صدائے توحید و حق پرستی بلند ہوتی ہے؟

اسلام کا مقصد اصلی دنیا میں حق و صداقت اور دفع باطل و ضلالت ہے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر خواہ وہ کسی صورت اور کسی شکل میں ہو اور یہ ممکن نہیں جب تک کہ ان تمام باطل پرستیوں اور گمراہیوں کو دور نہ کیا جائے جن کو حق کی ضد حقیقی یعنی قوت شیطانی مختلف مظاہر و اشکال میں ہمیشہ پیدا کرتی رہتی ہے۔ پس اس بنا پر ہر طرح کی انسانی گمراہیوں کے دور کرنے کے لئے سعی کرنا اور باطل و ظلم کے مقابلہ میں حق و عدل کا حامی ہونا عین مقصد اسلام و علت ظہور رسالت، و سبب نزول شریعت ہے۔ اور اسی نصرت حق و دفع باطل کی سعی و کوشش کا نام اصطلاح قرآنی میں "جہاد فی سبیل اللہ" ہے اس مطلب کو زیادہ واضح کرنے کے لئے یوں سمجھیئے کہ "امر بالمعروف" اسلام کا مقصد اصلی ہے۔ لیکن "امر بالمعروف" ہو نہیں سکتا۔ جب تک کہ نہی عن المنکر نہ کیا جائے۔ امر بالمعروف کے معنی ہیں۔ نیکی اور صداقت کی طرف بلانا اور اس کا حکم دینا، اور نہی عن المنکر سے مقصود ہے۔ برائیوں اور گمراہیوں کو رد کرنا لیکن نیکی اور صداقت تو برائیوں کے دور ہونے ہی کا نام ہے۔ اور روشنی کے معنی ہی یہی ہیں کہ تاریکی نہ ہو۔ کپڑا صاف کیونکر رہ سکتا ہے جب کہ آپ اُسے سیاہ دھبوں سے نہ بچائیں گے۔؟ پس امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر ناگزیر ہے اور نہی عن المنکر ہی کا دوسرا نام "جہاد فی سبیل اللہ" ہے۔

صاحب مفردات نے نہایت اچھا لفظ "ظاہراً و باطناً" کا رکھ دیا ہے۔ یہ باطل پرستی وضلالت کا استیلا کبھی تو انسان کے غولوں اور ان

جو لوگ تمام شیطانی طاقتوں سے باغی ہو کر "مقام اطاعت خدا و رسول" کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کا شمار انہی چار جماعتوں کے متبعین میں ہو جاتا ہے۔ اور ان کے رفیق اور ساتھی بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان تمام نعمتوں اور برکتوں کے بھی مستحق ہو جاتے ہیں۔ جن کا خدا تعالےٰ نے ان جماعت ہائے اربعہ کو مستحق قرار دیا ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ اور امر بالمعروف

اور یہی "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" ہے۔ جس کو قرآن کریم "جہاد فی سبیل اللہ" کے جامع و مانع لقب سے یاد کرتا ہے، اور اس کو قیام اسلام کا مقصد اصلی اور مسلمانوں کے تمام اعمال و عبادات کا مبدء حقیقی قرار دیتا ہے۔

"جہاد" لفظ "جہد" سے ہے جس کے معنی محنت، تعب، مشقت اور کسی کام کے لئے سخت تکلیف برداشت کرنے کے ہیں۔

پس جہاد کی تعریف یہ ہے۔

استفراغ الوسع فی مدافعۃ العدو ظاہراً وباطناً (مفردات امام راغب اصفہانی)

دشمن کے حملے کی مدافعت میں اپنی پوری طاقت اور قوت سے کوشش کرنا۔ وہ دشمن ظاہری حملہ آور ہو مثلاً اعدائے دین و ملت اور ان کا حرب و قتال، یا باطنی جیسے نفس و مظاہر شیطان۔

ضمیر کی اُن تمام کوششوں کو جو نفس و شیطان کے مقابلے میں کی جائیں، جہاد سے تعبیر کیا گیا، مثلاً فرمایا:۔ جاهدوا اهواء کم کما تجاهدون اعدائکم (اپنے ہوائے نفس کے مقابلے میں ویسا ہی جہاد کرو جیساکہ ظاہر دشمنوں کے مقابلہ میں ہتھیاروں سے جہاد کرتے ہو۔) اور فی الحقیقت یہی جہاد اکبر ہے۔ ایک دوسری حدیث میں جس کو نسائی اور ابوداؤد نے حضرت انس سے روایت کیا ہے زیادہ توضیح فرمائی ہے۔ کہ:۔ جاهدوا المشرکین بانفسکم واموالکم والسنتکم (باطل پرستوں کے مقابلے میں اپنی جان، اپنے مال، اور اپنی زبان کے ذریعہ جہاد کرو) یعنی فرض جہاد کبھی حرب و قتال کی صورت میں، کبھی اعلان حق کے لئے مال لٹانے کی صورت میں اور کبھی زبان سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی شکل میں انجام پاتا ہے۔

اسلام امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے آیا، اور امر بالمعروف اور جہاد دونوں ایک ہی حکم کے دو نام ہیں۔ پس ہر وہ کوشش جو حق کے لئے ہو۔ ہر وہ صرفِ مال جو سچائی اور نیکی کی خاطر ہو ہر وہ محنت و مشقت جو صداقت کے نام پر ہو، ہر وہ تکلیف و مصیبت جو اپنے جسم و جان پر راہ حق میں برداشت کی جائے، ہر وہ قید خانے کی زنجیر اور بیڑی جو اعلانِ حق کی وجہ سے پاؤں میں پڑے ہر وہ پھانسی کا تختہ، جس پر جمال حق و صداقت کا عشق لے جا کر کھڑا کر دے غرض کہ ہر قربانی جو بذریعہ جان، مال، اور زبان و قلم کے سچائی اور حق کی راہ میں کی جائے۔ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اور معنی جہاد میں داخل تم اپنا روپیہ اس کے نام پر لٹاؤ، اپنی گردنوں سے خون کا سیلاب بہاؤ، گردن کو طوق سے،

کے خونریز ہتھیاروں کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور کبھی اعتقادات اور اعمال و افعال کی صورت میں کبھی ضلالت تلوار و تفنگ ہاتھ میں لے کر مسجدوں کی محرابوں اور اذانوں کے مناروں پر علانیہ قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ تاکہ پرستاران حق کو نابود کر دے اور کبھی خیالات و عقائد کے مخفی ہتھیار لے کر چپکے چپکے ان انسانی قلوب اور اذہان کو مسخر کرنا چاہتی ہے جو حق کی پرستش کی مخفی مگر حقیقی عبادت گاہیں ہیں۔ کبھی وہ جنگ کی تلوار لے کر نکلتی ہے اور کبھی قرب کا دام و کمند۔ کبھی اس کے ہاتھ توپوں کے مشتعل کرنے کا فتیلہ ہوتا ہے۔ اور کبھی زہر آلود جام شربت، دونوں قوت شیطانی کے مظہر، اور دونوں اس کی حکومت کی ظاہر و مخفی فوج ہیں۔ پس "جہاد" کے معنی یہ ہیں کہ جب گمراہی کا ظہور جنگ کے ہتھیاروں کی صورت میں ہو تو پرستاران حق و امانت داران توحید کے ہاتھ میں بھی تیغ جہاد ہو۔ اور یہ دشمن ظاہری کے مقابلہ میں مدافعت ہے۔ لیکن جہاں گمراہی کا ظہور نفس و شیطان کی پھیلائی ہوئی باطل پرستی، اور جہل و ضلالت کے اعتقادات و اعمال اور اوہام و خیالات کی شکل میں ہو۔ تو وہاں مومن و مسلم کو "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے اسلحہ کے ذریعہ اپنی زبان اور قلم سے اس کے دفع و ابطال میں جہاد کرنا چاہیئے۔ اور یہ باطنی دشمن کے مقابلے میں مدافعت ہے۔

تشریح معنی جہاد

یہی سبب ہے کہ متعدد احادیث میں حکم جہاد کی تشریح کی گئی، اور طلب

میں سے شمار کیا ہے ؟

وجاهدوا في الله حق جهاده
هو اجتباكم وما جعل
عليكم في الدين من حرج
ملة ابيكم ابراهيم هو سما
كم المسلمين من قبل وفي
هذا ليكون الرسول
شهيدا عليكم وتكونوا
شهداء على الناس
فاقيموا الصلوة وآتوا الزكوة
واعتصموا بالله
هو مولاكم فنعم
المولى ونعم
النصير
(۲۲ : ۷۸)

اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ جو حق جہاد کرنے کا ہے۔ اس نے تم کو تمام دنیا کی قوموں میں سے برگزیدگی اور امتیاز کے لئے چن لیا، پھر جو دین تم کو دیا گیا ہے۔ وہ ایک ایسی شریعت فطری ہے جس میں تمہارے لئے کوئی رکاوٹ نہیں۔ یہی ملت تمہارے مورثِ اعلیٰ ابراہیم خلیل اللہ کی ہے اور اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ گزشتہ زمانوں میں بھی اور اب بھی تاکہ رسول تمہارے لئے اور تم تمام عالم کی ہدایت اور نجات کے لئے شاہد ہو۔ پس اللہ کے رشتے کو مضبوط پکڑلو جان اور مال دونوں کو اس کی عبادت میں لٹاؤ۔ وہی تمہارا ایک اور مالک ہے۔ اور پھر جس کا خدا مالک وحاکم ہو، اس کا کیا اچھا مالک ہے اور کیسا قوی مددگار!

فی الحقیقت یہ آیت کریمہ ہمارے مقصود اور (الہلال)، کی دعوت کے

ہاتھوں کو ہتھکڑیوں سے، پاؤں کو زنجیروں کے زیور سے عشقِ حق پرستی کا جلوہ گاہ بناؤ۔ زبان سے حق کا اعلان کرو! اور قلم کو توہین و تذلیل شیاطین ضلالت کے لیے وقف کر دو۔ اس کو عزت دو جو حق کی عزت کرتا ہے اور اس کو ذلیل کرو جو حق کو ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ دنیا کے رشتوں کو اللہ کے رشتے پر ترجیح دو۔ اور سب سے کٹ جاؤ۔ تاکہ اس کے ہو سکو۔ جس کی خاطر دوست بنو اور حق کی خاطر دشمن۔ نیکی کے آگے تمہاری گردن جھکی ہوئی، لیکن بدی کے آگے بلند مغرور رہو،

ان تمام حالتوں میں سے کوئی بھی حالت ہو، دراصل جہاد فی سبیل اللہ اور مقام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں داخل ہے۔ اور جس خوش نصیب کو تائید الٰہی اس کی توفیق دے، وہ مجاہد فی سبیل اللہ کے خطاب کا مستحق۔

حقیقت جہاد اور حقیقت اسلامیہ

یہی سبب ہے کہ حکم جہاد اسلام کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ اور کوئی ہستی مسلم و موحد نہیں ہو سکتی جس وقت تک کہ مجاہد نہ ہو۔ کیا نہیں دیکھتے کہ قرآن کریم میں ہر جگہ جہاد فی سبیل اللہ کو مسلم کی خصوصیات

کہ اللہ اور اس کے کلمۂ حق و صدق کی راہ میں جہاد کرو۔ اور اس کے لئے اپنی انتہائی سعیٔ اور تمام قوتیں وقف کر دو۔ تاکہ حق جہاد تم سے ادا ہو سکے۔

اور چونکہ اس حقیقت اسلامی اور اسوۂ ابراہیمی کے حاصل کرنے میں طرح طرح کے شدائد مصائب اور امتحان و ابتلا ناگزیر تھے۔ پس آخر میں کہا۔" واعتصموا باللہ ھو مولاکم " نفس کی ترغیبات ووساوس سے متاثر، اور باطل و ضلالت کے دنیوی ساز وسامان اور قوت و عظمت سے مرعوب مت ہو۔ صرف اللہ کے ہو جاؤ۔ اور اس کے رشتے کو مضبوط پکڑ لو۔

اوروں نے دنیا میں اپنے بہت سے آقا اور مالک بنالئے ہیں مگر تمہارے لئے وہ سب اصنام وطواغیت ہیں۔ تمہارا مالک ایک مالک الملک ہے۔ پس کیا اچھا وہ مالک ہے اور کیا اچھا مددگار! اسی پر بھروسہ کرو۔ اور تمام عالم سے بے خوف و نڈر ہو جاؤ۔ ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم، وان یخذلکم فمن ذا الذی ینصرکم من بعدہ؟ وعلی اللہ فلیتوکل المومنون۔ (۳ : ۱۰۴)

عود الی المقصود

پس در حقیقت "امر بالمعروف" ایک اشرف ترین جہاد فی سبیل اللہ

اظہار کے لئے ایک شہادت قاہرہ اور منکرین حق و پرستاران نفاق کے قلع و قمع وہدایت کے لئے سیف اللہ المسلول ہے۔

فللہ الحجۃ البالغۃ فلو شآء لھدٰکم اجمعین (۱۶۔۱۵۰)

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو تمام عالم میں فضیلت و بزرگی عطا فرمانے کی بشارت دی۔ حضرت ابراہیم کی طرف اشارہ کر کے ان کے اس "اسوۂ حسنہ" پر توجہ دلائی کہ انہوں نے راہِ محبت الٰہی میں اپنے نفس کے جذبات اور اپنے فرزند عزیز کی جان قربان کر دی تھی، اور تم انہی کے پیرو اور انہی کے ملت حنیفی کی طرف منسوب ہو" اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ۔ کہہ کر جسم و مال، دونوں کے ایثار و قربانی کی تعلیم دی کہ:۔ فی الحقیقت نماز سے مقصود اپنی تمام نفسانی خواہشوں اور قوتّت پر عبودیت کے عجز و انکسار کی قربانی طاری کرنی ہے۔ اور اس کے بخشے ہوئے سر کو اسی کی چوکھٹ پر رکھ دینا ہے۔ اور زکوٰۃ کا حکم ایثار مال و دولت کا حکم دینا ہے۔" تاکہ انسان اپنی پیدا کی ہوئی دولت میں انفاق فی سبیل اللہ کو بطور ایک شریک کاروبار حق دار کے حصہ کے ہمیشہ تسلیم کرتا رہے۔ اس کے بعد امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو نسبت ابراہیمی و اسلام کی علت حنیفی قرار دیا۔ اور کہا کہ تمہارا نام مسلم اسی لئے رکھا گیا ہے۔ تاکہ تم اعلان حق کر کے تمام عالم کے گواہ بنو اور رسول تمہاری اطاعت کا شاہد ہو۔" اور پھر تمام خصوصیات و خصائل کو آغاز آیت میں بطور نتیجہ بیان کے پیش کیا کہ" جاھدوا فی اللہ حق جھادہ " یعنی جب کہ ان تمام فضائل و خصائل سے تم متصف کئے گئے ہو۔ پس تمہارا فرض ہے

اللہ اور اس کے رسول کے مطیع و منقاد ہو جاتے ہیں۔ خدا تعالے ان کو اپنی ان محب و محبوب جماعتوں میں شامل کر دیتا ہے۔ جن کو اس نے اپنی نعمتوں اور برکتوں کے لئے چن لیا ہے۔ اور پھر وہ لوگ صالحین امت کے مرتبے تک پہنچ کر بادہ نوشان جام شہادت کے مقام پر فائز المرام ہوتے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد براہ راست آفتاب نبوت سے بہرہ اندوز انوار و تجلیات ہوتے ہیں۔

ومن بعد هذا ما يدق صفاته

وما كتمه احظى لديا واجمل

ہم نے آغاز تحریر میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ مقام اطاعت خدا اور رسول کے معنی یہ ہیں۔ کہ انسان ہر طرف سے کٹ کر صرف خدا اور اس کے کلمۂ حق کا ہو جائے۔ اور دنیا میں جس قدر اس سے باغی قوتیں ہیں ان کی طرف سے منہ موڑ لے کہ :-

ومن يسلم وجهه الى الله وهو محسن فقد استمسك بالعروة الوثقىٰ (۳۱ : ۲۱)	اور جس نے ہر طرف سے گردن پھیر کر اللہ کی طرف منہ کر لیا۔ اور حسن عمل اختیار کیا، تو لیں یقین کر و۔ کہ اس نے اللہ کی اطاعت کی رسی مضبوط پکڑ لی۔

اور یہی حقیقت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ہے۔ پس جو لوگ اطاعت خدا و رسول کے ذریعہ دوستان الٰہی کی صفوں میں داخل ہو گئے ضرور ہے کہ اللہ تعالے ان کو بھی " الذين انعم الله عليهم " میں شامل کر کے

ہے۔ جس کے سلسلۂ حقہ کے تاقیامت قائم رہنے کا ہم سے وعدہ کیا گیا ہے اور احادیث صحیحہ میں خبر دی گئی ہے۔ کہ باوجود شیوع فتن و فساد، امت مرحومہ میں ہمیشہ ایک جماعت حق قائم رہے گی۔ جس کے مجاہدات کو حق تعالیٰ احیاءِ شریعت اور تجدید حیات ملت کا وسیلہ بنا دے گا۔ اور پھر ان احادیث میں اُس جماعت کی سب سے بڑی علامت یہ بتلائی گئی ہے کہ: ۔ ظاهرین علی الحق لا یضرهم من خذلهم حتی یاتی امر الله وهم کذلک۔ یعنی وہ جماعت منصور من اللہ ہو گی۔ اللہ اس کی دعوت حق کی حفاظت کرے گا۔ اس کو گمراہ جماعتوں پر فتحیاب رکھے گا۔ اور شیاطین ضلالت جو زبانیں اس کی مخالفت کریں گی۔ وہ اسے کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔ یہ حالت برابر قائم رہے گی۔ یہاں تک کہ قیامت کا ظہور ہو۔

نزول نعائم الٰہیہ و نصرت ربانیہ

اوپر یہ پیشین گوئی صدہا آیات کریمہ، و تجارب تاریخیہ، و مشاہدات اہل حق و معارف کے عین مطابق ہے۔ وہی آیت کریمہ، جس کو ہم نے خطبۂ مضمون کے آخر میں درج کیا تھا۔ ہم کو اس علامت کی خبر دیتی ہے۔ ومن یطع الله والرسول فاولئک مع الذین انعم الله علیهم من النبیین والصدیقین والشهداء والصالحین، وحسن اولئک رفیقا۔ (۴: ۷۱) کہ یہ لوگ تمام شیطانی قوتوں سے باغی ہو کر صرف

متحرک ہوتی ہے اور صف اعدا پر گرتی ہے۔ وہ کارزار عالم میں تن تنہا اور بے یار و مددگار ہوتے ہیں۔ مگر ان کے یمین و یسار نصرت خداوندی کے ملائکہ مسومین کی صفیں ہوتی ہیں۔ خدا ان کے عجز کو اپنی کبریائی سے ان کے تذلل و انکسار کو اپنی عظمت و عزت سے ان کے ضعف و کمزوری کو اپنی قوت و طاقت سے اور ان کی بے سازو سامانی کو اپنی مالک الملکی سے بدل دیتا ہے اور جب وہ بولتے ہیں تو ان کی آواز میں صدائے حق کی گرج ہوتی ہے۔ اور جب نظر اٹھاتے ہیں تو ان کی نگاہوں سے نور الٰہی کے شعلے نکلتے ہیں۔ ان کی آواز سے نسل شیطانی کے طاقت ور دل دہل جاتے ہیں اور ان کی نگاہوں کی طرف گمراہی و ضلالت کی نظریں اٹھ نہیں سکتیں۔ کیوں کہ تم انسان کی آواز اور نظر کا مقابلہ کر سکتے ہو۔ لیکن خدا کی آواز پر غالب آنے اور اس کی نظر کی تاب لانے کی کس میں طاقت ہے؟

فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به، و بصره الذی یبصر به، و یده التی یبطش بها، و رجله التی یمشی بها، و لسانه الذی یتکلم به۔ و لئن سالنی لاعطینه، و لئن استعاذنی لاعیذنه۔

جب میں اپنے کسی بندے کو اپنا دوست بنا لیتا ہوں۔ تو اس کا کان ہو جاتا ہوں۔ وہ میرے کان سے سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں وہ میری آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں وہ میرے ہاتھ سے پکڑتا ہے۔ اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں۔ وہ میرے پاؤں سے چلتا ہے۔ اور اس کی زبان ہو جاتا ہوں۔ وہ میری زبان سے بولتا ہے: پھر وہ جو مانگتا

اپنی نعمتوں اور غیبی برکتوں کا مورد و مہبط بنا دے۔ اور دنیا میں سب سے بڑی نعمت الہٰی نتیجۂ کار کی فتح مندی، اور ہمتوں اور عزموں کی کامیابی اور فلاح ہے۔

چونکہ وہ لوگ اپنے تئیں خداتعالےٰ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اور اس کے کلمۂ حق کے اعلان کے لئے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ وقف ہو جاتے ہیں۔ پس خداتعالےٰ بھی بحکم:۔ من تقرب الیّٰ شبرا تقربت الیہ ذراعا۔ (جو میرا بندہ ایک بالشت بھر میری طرف چلتا ہے۔ میں ایک ہاتھ آگے بڑھ کر اس سے قریب تر ہو جاتا ہوں) ان کو اپنا بنا لیتا ہے۔ اور ان کے تمام کاموں پر اپنی عزت اور کبریائی کی چادر ڈال دیتا ہے۔ پھر وہ کام ان کے نہیں رہتے بلکہ خدا کے ہو جاتے ہیں، اور ان کو انجام دینے والی ان کے جسم و نفس کی قوتیں نہیں ہوتیں، بلکہ اللہ کا مقتدر و قاہر ہاتھ ہوتا ہے ان کی آواز گو ان کے حلق سے نکلتی ہے۔ لیکن چونکہ حق و معروف کی آواز ہوتی ہے، اس لئے ان کی نہیں، بلکہ صوت الہٰی کی صدائے لازوال ہوتی ہے۔

وہ راہ الہٰی میں مجاہد ہوتے ہیں پس خدا بھی ان کو اپنی فوج بنا لیتا ہے، اور ان کے ہاتھ میں اپنی تائید و نصرت کا حربہ دے کر ایک پیچھے رہ کر لڑانے والے سپہ سالار کی طرح لڑاتا ہے۔ بظاہر وہ بے مایہ و سامان، اور حقیر و عاجز انسان نظر آتے ہیں۔ مگر ان کا دل قوتِ الہٰی اور جبروتِ ربانی کا مسکن ہوتا ہے۔ ان کے ہاتھ دنیا کے ظاہری ہتھیاروں سے خالی ہوتے ہیں۔ پر خدائے قدوس کی شمشیر جلال ان کی انگلیوں کی حرکت ہے،

لھم الغالبون ر ۳۸ : ۱۷۱) | سے بیشک رہی فتح مند اور کامیاب و مظفر ہونے والے ہیں۔ اور یقیناً ہماری فوج ہے سب پر غالب آکر رہے گی۔

اگر چشم دل وا، اور دیدۂ حق بیں کور نہ ہو، تو فی الحقیقت دنیا میں نصرت الٰہی کی نیرنگیوں کی سب سے بڑی نشانی اس جماعت کے عجائب کار و بار دعوت میں ہوتی ہے۔ دنیا میں حق و صداقت کی آواز کبھی بھی تاج و تخت اور ایوان و محل کے اندر سے نہیں اٹھتی ہے۔ بلکہ ہمیشہ اس کا سرچشمہ ویران جنگلوں، پھونس کے جھونپڑوں، اور پہاڑوں کے غاروں کے اندر بہا ہے اور یہ بھی اس شاہد عجائب پسند کا عجیب و غریب کرشمہ ہے۔ کہ ہمیشہ شکستگی اور افتادگی ہی کو محبوب رکھتا ہے۔ اپنا گھر بھی بناتا ہے تو ٹوٹے ہوئے اور زخمی دلوں کو اپنی آواز بھی سناتا ہے۔ تو کانٹے پڑے ہوئے خشک حلقوں سے اپنی نگاہوں کا جلوہ بھی دکھلاتا ہے۔ تو گرد نوں کو خونچکانی اور تڑپتی ہوئی لاشوں کے اضطراب میں۔ اور پھر اپنے حسن و جمال کا جلوہ گاہ بھی بنائے گا۔ تو تاریک غاروں، شکستہ دیواروں، پھٹی ہوئی چٹائیوں کو :-

مجھ بہ محمل شاہی، کہ در ولایت عشق
گدا بہ تخت نشانند و پادشہ گیرند

پھر اگر وہ نہیں ہے تو کون ہے۔ جس کا ہاتھ گلیم فقر و مسکینی سے نکلتا ہے۔ اور بادشاہوں کے تخت و تاج کو الٹ دیتا ہے؟ یہ کس کی تماشہ آرائی ہے کہ چند بے نوا فقیروں کو کھڑا کر دیتا ہے۔ اور دنیا کی بڑی بڑی قوتوں کے تسلط سے نکال کر لاکھوں دلوں کو

ہے اسے عطا کرتا ہوں ۔ اور جب پناہ مانگتا ہے تو اپنی میں لے لیتا ہوں ۔

چشم و گوشش و دست و پائم او گرفت
من بدر رفتم سرائم او گرفت
ایں بصر دیں سمع ، چوں آلات اوست
ملک ذرات تنم مرآت اوست
نغمہ از نائیست نے از نے ، بداں
مستی از ساقیست ، نے از مے بداں
گفتن او گفتن اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود
ما چو مست از دیدن ساقی شدیم
مست گشتیم از فنا باقی شدیم

پس چونکہ اس جماعت کے تمام کاموں کو اللہ اپنا کام بنا لیتا ہے ۔ اس لئے خود ان کا وجود کتنا ہی ناکام و حقیر ہو لیکن ان کے کام کامیاب و عظیم ہوتے ہیں ، اور وہ بھی دنیا میں ناکامی و نامرادی سے ذلیل و رسوا نہیں ہوتے ۔ وہ خدا کا ہاتھ ، یا پھر اس کی فوج ہوتے ہیں ۔ پس خود ان کو شکست کا غم ہو ، لیکن خدا کو شکست کا خوف نہیں ؟

ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا
المرسلین انھم لھم
المنصورون وان جندنا

اور ہم نے اپنے جن بندوں کو ارشاد و ہدایت
کے لئے دنیا میں بھیجا ۔ ان کی نسبت پہلے ہی
ان سے ہم نے کہہ دیا ہے کہ ہماری تائید و نصرت

اپنے آگے سربسجود کرالیتے ہیں :- افسحر هٰذا ام انتم لا تبصرون
(۵۲:) افمن هٰذا الحدیث تعجبون؟ ویضحکون ولا تبکون؟
وما یعقلها الا العالمون (۲۹:۴۳)۔

مبین حقیر گدایان عشق راکیں قوم
شہانِ بے کمر و خسرواں بے کلہ اند

ختم شد